یو-ڈی-04

وردھمان مہاویر کُھلا وشووِدیالیہ، کوٹہ

اردو شاعری اور بلاغت

کورس ڈولپمینٹ کمیٹی

چیئرمین : **پروفیسر (ڈاکٹر) ونئے کمار پاٹھک**، وائس چانسلر، وردھمان مہاویر کھلا وِشوِدیالیہ، کوٹہ

کنوینر

ڈاکٹر یعقوب علی خان

ممبران

۱۔ پروفیسر قاضی جمال حسین، شعبۂ اردو، اے۔ایم۔یو، علی گڑھ
۲۔ پروفیسر معین الدین جینا بڑے، شعبۂ اردو، جے۔این۔یو، دہلی
۳۔ پروفیسر فیروز احمد (ریٹائرڈ)، شعبۂ اردو، راجستھان یونی ورسٹی، جے پور
۴۔ پروفیسر فاروق بخشی، شعبۂ اردو، ایم۔ایل۔ایس۔یو، اُدے پور
۵۔ ڈاکٹر محمد نعیم فلاحی، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، کوٹہ

چیف ایڈیٹر	ایڈیٹر
ڈاکٹر یعقوب علی خان	**ڈاکٹر قاسم علی خاں**
کنوینر اردو، وردھمان مہاویر کھلا وِشوِدیالیہ، کوٹہ	موظف پروفیسر شعبۂ اردو، ڈاکٹر بی.آر.اے.او.یو، حیدرآباد

مضمون نگار		اکائی نمبر
ڈاکٹر عمر جہاں	شعبۂ اردو، گورنمنٹ گرلز کالج، ٹونک، راجستھان	2،1
ڈاکٹر قمر سلیم	بمبئی	3
ڈاکٹر نادرہ خاتون	صدر، شعبۂ اردو، جے۔ڈی۔بی گرلز کالج، کوٹہ، راجستھان	5،4
پروفیسر عتیق اللہ	سابق صدر شعبۂ اردو، یونی ورسٹی آف دہلی، دہلی	7،6
ڈاکٹر اقبال مسعود	(ریٹائرڈ سکریٹری) مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، بھوپال	8
جناب ضیاالرحمٰن صدیقی	سی۔ائی۔ائی۔ایل، سپرون، سولن، ہماچل پردیش	9
پروفیسر توقیر احمد	شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی	10
ڈاکٹر ارشاد احمد	مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، حیدرآباد	11
ڈاکٹر اجمل حمید	مسلم گرلز کالج، جے پور، راجستھان	12
پروفیسر آفاق حسین صدیقی	موظف پروفیسر، بھوپال	13
جناب عبدالحفیظ	گیسٹ فیکلٹی (اردو)، وی ایم او یو، کوٹہ	14
ڈاکٹر رئیس فاطمہ	یونی ورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد	18،16،15
پروفیسر نسیم الدین فریس	صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، حیدرآباد	17

اکیڈمک اور ایڈمنسٹریٹو نظام

پروفیسر (ڈاکٹر) وِنئے کمار پاٹھک	پروفیسر ایل۔آر۔گرجر	جناب یوگیندر گویل
وائس چانسلر	ڈائریکٹر، اکیڈمک	انچارج، ایم۔پی۔ڈی
وردھمان مہاویر کھلا وِشوِدیالیہ، کوٹہ	وردھمان مہاویر کھلا وِشوِدیالیہ، کوٹہ	وردھمان مہاویر کھلا وِشوِدیالیہ، کوٹہ

یو۔ڈی۔04

وردھمان مہاویر کُھلا وشوِدیالیہ، کوٹہ

اردو شاعری اور بلاغت

فہرست مضامین		صفحہ نمبر
اکائی 1	اردو مثنوی: تعارف اور صنفی خصوصیات	5
اکائی 2	انتخاب سحر البیان (میر حسن)	13
اکائی 3	انتخاب گلزار نسیم (دیا شنکر نسیم)	21
اکائی 4	اردو مرثیہ: تعارف اور صنفی خصوصیات	33
اکائی 5	نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری (میر انیسؔ)	39
اکائی 6	اردو نظم: تعارف اور صنفی خصوصیات	47
اکائی 7	آدمی نامہ (نظیر اکبر آبادی)	58
اکائی 8	برکھارت (حالی)	67
اکائی 9	تعلیم نسواں (اکبر الہ آبادی)	75
اکائی 10	شعاعِ امید (اقبال)	83
اکائی 11	خاک ہند (چکبست لکھنوی)	89
اکائی 12	البیلی صبح (جوش)	97
اکائی 13	تنہائی (فیض)	103
اکائی 14	اودیس سے آنے والے بتا (اختر شیرانی)	109
اکائی 15	رباعی: تعارف اور صنفی خصوصیات	127
اکائی 16	انتخاب رباعیات (انیس)	140
اکائی 17	انتخاب رباعیات (امجد حیدر آبادی)	153
اکائی 18	علم بلاغت	165

اکائی 1 اردو مثنوی: تعارف اور صنفی خصوصیات

اکائی کے اہم اجزا

1.1 اغراض ومقاصد

1.2 تمہید

1.3 مثنوی کی تعریف اور اس کا فن

1.4 مثنوی کے اجزائے ترکیبی

1.5 مثنوی کا آغاز وارتقا

1.6 مثنوی کی اہمیت

1.7 خلاصہ

1.8 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1.9 معاون کتب

1.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں مثنوی کی اہمیت، افادیت، تعریف، فن اور آغاز وارتقا سے واقف کرایا گیا ہے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ:

- ☆ مثنوی کی تعریف اور اس کے فن کو سمجھا سکیں۔
- ☆ مثنوی کی خصوصیات واضح کر سکیں۔
- ☆ مثنوی کی تاریخ سے واقف کرا سکیں۔

1.2 تمہید

مثنوی اردو شاعری کی اہم صنف ہے۔ اس صنف میں غزل کی رعنائیاں بھی ہیں اور قصیدہ کی شان وشوکت بھی، رندان بلانوش کی ہائے ہو کے نعرے بھی ہیں تو صوفیوں کی اللہ اکبر کی صداؤں کے ساتھ حسن وعشق کی داستانیں بھی ہیں، غرض کو ن سا راگ ہے جو کہ مثنوی کے ساز پر نہیں گایا گیا ہو۔

مثنوی انسانی زندگی کے اعمال وکردار پر روشنی ڈالتی ہے نیز واقعات کے تسلسل کے ساتھ ارادوں کی کشمکش اور حرکات و اعمال کی جدوجہد بھی اس صنف میں نظر آتی ہے۔

1.3 مثنوی کی تعریف اور اس کا فن

مثنوی لفظ ثنا سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں؛ دو؛ دو؛ کیا ہوا۔ مثنوی کے ہر شعر میں اس کا قافیہ بدل جاتا ہے۔ اس طرح دو؛ دو ہم قافیہ مصرعوں کی رعایت سے ہی اس صنف کو مثنوی کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر

وہ اجلا سا میداں چمکتی سی ریت
اگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے سائے سے مہ کا ظہور
گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور

ان اشعار میں پہلے شعر میں؛ ریت؛ اور؛ کھیت؛ قافیہ ہیں دوسرے شعر میں؛ ظہور؛ اور؛ نور؛ یہ دونوں بھی قافیہ ہیں۔ پہلے اور دوسرے شعر کے قافیہ مختلف ہیں اس طرح یہ مثنوی کی ہیئت یا بناوٹ کہی جاسکتی ہے۔

چوں کہ صنف مثنوی میں ہر شعر میں قافیہ تبدیل ہوتا ہے اور مثنوی نگار کو قافیہ کی تلاش میں پریشان نہیں ہونا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں طویل مثنویاں کافی تعداد میں لکھی گئی ہیں اور طویل داستانوں کے ساتھ ساتھ ان میں مختصر قصے بھی نظم کیے گئے ہیں۔

مثنوی میں ہر قسم کے موضوعات کو جگہ دی گئی ہے ان میں حسن و عشق، رزم و بزم، تصوف و اخلاق، فلسفہ و سماج غرض کہ ہر قسم کے موضوعات کو نظم کیا گیا ہے۔ ان مثنویوں میں فوق الفطری کردار بھی فعال نظر آتے ہیں جیسے کہ جن، پری، دیو وغیرہ

دکن میں رزمیہ مثنویاں خاصی تعداد میں لکھی گئی ہیں جب کہ شمالی ہند میں عشقیہ مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ جیسے مثنوی زہر عشق سحر البیان اور گلزار نسیم وغیرہ۔ ان کے علاوہ مولانا آزاد اور مولانا حالی نے مناظر فطرت اور سماجی مسائل کو مثنویوں کا موضوع بنایا ہے۔

غرض یہ کہ مثنوی کی دنیا بڑی وسیع ہے اور اس دنیا میں ہر طبقے، ہر تہوار، ہر رسم و رواج، لباس، سواریاں، شائستہ زبان کے ساتھ ساتھ بولی ٹھولی، محاورے، ضرب المثل، ہر مذاق کا بیان، جذبات نگاری، منظر نگاری، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، ڈرامہ نگاری، قومی یکجہتی غرض یہ کہ سب ہی کچھ ملتا ہے۔

1.4 مثنوی کے اجزائے ترکیبی

آیئے اب ہم مطالعہ کریں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ مثنوی کے اجزاء یا عناصر کیا ہیں؟

مثنوی کے اجزا حسب ذیل ہیں

(۱) حمد و نعت
(۲) مدح فرمانروائے وقت
(۳) تعریفِ شعر و سخن

(۴) قصہ یا اصل موضوع

(۵) خاتمہ

مثنوی کی ابتدا حمد و نعت سے کی جاتی ہے اس میں اپنے رب کی تعریف اور رسول پاک ﷺ کی نعت بیان کی جاتی ہے، بہت سے شعراء نے منقبت بھی لکھی ہے، مثنوی کے اندر مذہبی مسلک اور عقائد کی کوئی قید نہیں ہے۔ مثنوی گلزار نسیم میں پنڈت دیا شنکر نسیم نے بڑی عقیدت سے حمد و نعت لکھی ہے۔

بہت سے مثنوی نگاروں نے ان عناصر کی روایت سے انحراف بھی کیا ہے اور میرؔ و سوداؔ نے اپنی ہجویہ مثنویوں میں اس کا التزام نہیں کیا ہے۔

مثنوی کا دوسرا جز مدح حاکم فرمانروائے وقت ہوتا ہے ان کی تعریف کرنا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ درباروں سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کے لئے روزی روٹی کا مسئلہ ہوتا ہے اور حکمراں کی تعریف وسیلۂ روزگار تھا۔

مثنوی کے تیسرے حصے میں اپنی شاعری کی تعریف اور تعلّی کی جاتی ہے تا کہ اپنی شاعرانہ اہمیت کو ثابت کیا جا سکے۔

مثنوی کو طویل نظم یا منظوم داستان بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے اندر کوئی واقعہ تسلسل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ حالیؔ نے اسی لیے اس صنف کو سب سے زیادہ کارآمد بتایا ہے کیونکہ اس کے اندر ہر قسم کے مضامین بیان کرنے کی گنجائش ہے۔ مثنوی نگار نفس قصہ اور موضوع کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں، مثنوی کا خاکہ تیار کر کے اس کی تکمیل کی جاتی ہے اس وجہ سے واقعات کی ترتیب و تعمیر میں تسلسل ہونا ضروری ہے، واقعہ نگاری فطری بھی ہو سکتی ہے اور غیر فطری بھی یعنی اس میں انسانی کرداروں کے ساتھ ساتھ فوق الفطری کردار بھی فعالیت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کرداروں کے جذبات، احساسات، اور نفسیات کا اظہار رواں دواں نظر آتا ہے، کردار اپنے مکالمے کے ذریعہ مثنویوں میں فعال نظر آتے ہیں اس لیے مثنوی نگار کو جذبات نگار، نفسیات نگار اور مکالمہ نگار ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔

مثنوی کے واقعات میں عروج، جدوجہد، کلائمکس اور خاتمہ ہوتا ہے، مثنویوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ زیادہ تر مثنویوں کا خاتمہ دل چسپ اور خوشگوار ہوتا ہے اور ہیرو ہیروئن آخر میں مل جاتے ہیں۔ مثنویاں اپنے دور کے ماحول کی عکاسی کرتی ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے کہا ہے کہ

''تمام اصنافِ سخن میں مثنویوں میں تہذیب کی مرقع کشی سب سے زیادہ ہوئی ہے۔''

دکن کی مثنویوں میں دکنی سماج و معاشرت جلوہ گر ہے تو شمالی ہند کی مثنویوں میں دہلی اور لکھنوی معاشرت کی جھلکیاں بہ خوبی دیکھی جا سکتی ہیں، اس دور کا نظام جاگیردارانہ تھا اور یہی طبقہ اعلیٰ شمار ہوتا تھا گویا کہ شعراء کے لئے یہ جاگیردار، نواب اور حکمراں آئیڈیل ہوا کرتے تھے اس لئے مثنویوں میں یہی طرز حیات بیان کی جاتی تھی۔

آیئے! اب ہم مثنویوں کے مطالعے سے اس دور کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہماری زندگیوں میں ہر موقع کے رسم و رواج کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بچوں کی پیدائش پر چھٹی، چلہ، عقیقہ وغیرہ کا رواج ہے اور مثنویوں میں ایسے رسم و رواج کا اہتمام کیا جاتا ہے، اسی طرح سے شادی بیاہ میں بہت سی رسمیں ادا کی جاتی ہیں، میلے ٹھیلے جلوہ جلوس، کھیل کود، بازیاں جیسے چوسر وغیرہ کا بیان مثنویوں کا ایک اہم حصہ ہے، اسی طرح سے جاگیردارانہ نظام میں

نواب یا حکمراں، ان کے وارث دائیاں، کھلائیاں، کنیزیں، غلام، اتالیق، رمال وغیرہ کا بیان بھی بڑے دلچسپ پیرائے میں کیا جاتا ہے۔

مثنویوں میں مذہبی عقائد اور مزارات کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ لباس کی اقسام نیز سرتا پا زیورات وغیرہ کا ذکر بھی تفصیل سے ملتا ہے ان کے علاوہ رقص وسرور کی محفلیں اور ان کی تفصیلات بھی مثنویوں میں جلوہ گر رہتی ہیں۔

اسی طرح سے اس زمانے کے شعرا اور ان کی کتابوں کے نام بھی مثنوی میں ملتے ہیں جیسے ظہوری اور نظیر کا انتخاب اور کچھ انتخاب سوداؔ، میرؔ اور میر حسنؔ کے بھی اس دور کے شعر وادب کے ذوق کو ظاہر کرتے ہیں۔

مثنوی سحر البیان میں بیان طویل ہے لیکن مثنوی: گلزار نسیم: کا سب سے بڑا وصف اس کا اختصار اور جامعیت ہے بڑے سے بڑے واقعے کو نسیمؔ نے اختصار سے ایک دو شعر میں بیان کر دیا ہے۔

لکھنوی طرز معاشرت کی ایک اہم مثنوی: زہر عشق: ہے اس کے اشعار ضرب المثل بن گئے ہیں اور اس مثنوی کو عریانی اور فحاشی کی مثال کہا جاتا ہے جب کہ سچائی یہ ہے کہ: زہر عشق: نہ تو عریاں ہے اور نہ ہی فحش۔ وہ معاشرت میں جنم لینے والی ایک عشق کی چھوٹی سی کہانی ہے جو کہ موجودہ دور میں ایک نارمل بات ہی کہی جاسکتی ہے، اس مثنوی میں نہ تو لباس کا ذکر ہے اور نہ ہی زیور کا اور نہ کسی رسم رواج کا بیان ہے صرف واردات کا اظہار کیا گیا ہے جو کہ لکھنوی معاشرت کا عام رجحان تھا۔

1.5 مثنوی کا آغاز وارتقا

ابھی تک ہم نے مثنوی کے فن اور اس کے موضوعات وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے۔ اب ہم مثنوی کے ارتقاء کا جائزہ لیں گے۔

اردو مثنوی کو دکن میں فروغ حاصل ہوا۔ دکن کی شاعری میں مثنوی لکھنے کا زیادہ رجحان ملتا ہے، اور اسی رجحان کی وجہ سے نویں صدی ہجری سے گیارہویں صدی ہجری کے درمیان کافی تعداد میں مثنویاں لکھی گئیں ہیں۔

دکن کی پہلی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' ہے جو کہ فخر الدین نظامی نے لکھی ہے۔ اس دور میں میراں جی شمس العشاق نے ''شہادۃ الحقیقت'' اور ''خوش نامہ''؛ تصوف سے متعلق، سید اشرف بیابانی کی ''نوسرہار''؛ برہان الدین جانم کی ارشاد نامہ، وصیت الہادی، حجت البقاء، نسیم الکلام، صفت الکلام؛ عبدل کی ابراہیم نامہ اور ملا وجہی کی قطب مشتری اہم مثنویاں ہیں۔

ملا وجہی کی مثنوی ''قطب مشتری'' دکن کی پہلی طبع زاد مثنوی ہے۔ اس کو ملا وجہی نے ۱۶۰۹ء میں تصنیف کیا تھا۔ اس مثنوی کا موضوع قلی قطب شاہ اور مشتری کی عشق کی داستان کا بیان ہے۔ والیٔ گولکنڈہ ابراہیم کے بیٹے قلی قطب شاہ کو خواب میں ایک حسینہ دکھائی دیتی ہے اور وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو کر کافی پریشانیاں اٹھا کر اس کو حاصل کر لیتا ہے۔ اس طرح سے دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ اس کہانی کا پلاٹ سادہ اور تسلسل کے ساتھ ہے۔ اس کے کردار بے شمار ہیں جن کے اندر فوق الفطری کردار بھی شامل ہیں لیکن منظر نگاری کے لحاظ سے یہ مثنوی بہت اہم مانی جاتی ہے۔ اس کے اندر محلوں اور باغوں کی منظر نگاری دلکش اور اعلیٰ درجے کی ہے۔

غواصی نے تین مثنویاں لکھیں: سیف الملوک بدیع الجمال، طوطی نامہ اور مینا ستونتی ہیں۔ مقیمی کی چندر بدن اور مہیار بھی قابل قدر مثنوی ہے۔ اسی دور کی اہم مثنویوں میں نصرتی کی ''گلشن عشق'' اور ''علی نامہ'' بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ابن نشاطی کی

''پھول بن'' بھی قابل ذکر ہے۔

نصرتی نے گلشن عشق ۱۶۵۷ء میں لکھی تھی۔اس میں منوہر اور مدمالتی کے عشق کی داستاں کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس میں حمد اور نعت، منقبت، حکمراں کی تعریف اور عقل و عشق کے موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز اس کا سبب تالیف بھی بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک طویل مثنوی ہے۔اس کے اندر راجہ منوہر، مالتی، چندرسین اور چمپاوتی کے عشق کی داستان کو نظم کی گیا ہے۔قصہ مربوط ہے، مثنوی کے سبھی اجزا کا اہتمام کیا گیا ہے، زبان و بیان کے اعتبار سے اس مثنوی کو بہترین مثنوی تسلیم کیا جاتا ہے۔

نصرتی کی علی نامہ ۱۶۶۵ء میں لکھی گئی تھی اور یہ ایک رزمیہ مثنوی ہے۔ یہ شاہ نامہ کے انداز میں لکھی گئی ہے، اسی لیے اس کو دکن کا شاہ نامہ کہا جاتا ہے۔قلعہ پنالہ علی عادل شاہ نے فتح کیا تھا، اسی کا بیان اس مثنوی میں کیا گیا ہے۔ اس میں باقاعدہ عنوان تحریر کیے گئے ہیں۔ ابتدا میں حمد و نعت، منقبت، مدح اور پھر میدان جنگ کے نقشے، فوجوں کے معرکے اور ہتھیاروں کا استعمال اور فتح کا ذکر کیا گیا ہے۔نصرتی کی زبان و بیان پر قدرت اس مثنوی کی خوبی ہے۔

مثنوی ''پھول بن'' ابن نشاطی نے تحریر کی ہے۔ یہ ایک فارسی قصہ ہے جس کو اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے اور اس میں مذہبی پند و نصائح بیان کیے گئے ہیں۔ابن نشاطی کی زبان پر پنجابی زبان کے اثرات ہیں۔ یہ مثنوی دکنی زبان کی ممتاز مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔

سراج اورنگ آبادی کی بوستان خیال، لچھمی نارائن شفیق کی تصویر جاناں بھی اس دور کی قابل ذکر مثنویاں ہیں۔ جنیدی کی ماہ پیکر، طبعی کی بہرام و گل اندام، فائز کی رضوان اور روح افزا، ہاشمی کی یوسف زلیخا، رستمی کی طویل مثنوی خاور نامہ دکن کی بہترین مثنویاں تسلیم کی جاتی ہیں۔

اس زمانے میں مذہبی نوعیت کی مثنویوں میں عشرت کی چت لگن، بحری کی من لگن اور ولی ویلوری کی روضۃ الشہدا، اشرف کی جنگ نامہ قابل ذکر مثنویاں ہیں، جب کہ رومانی قصے میں عاجز کی قصۂ لعل و گہر اور آگاہ کی گلزار عشق کافی مشہور ہیں۔

دکن میں مذہبی نوعیت کی صوفیانہ، رزمیہ، بزمیہ غرض سب ہی قسم کے موضوعات پر شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔زبان کے لحاظ ان میں دکن کی زبان استعمال کی گئی ہے جو کہ فطری ہے۔اس کے علاوہ کچھ فارسی اور سنسکرت کے قصوں کو بھی اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے، جیسے کہ غلام علی نے جائسی کی پدماوت کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

شمالی ہند میں اردو مثنویاں اتنی زیادہ تعداد میں تو نہیں لکھی گئیں جتنی کہ دکن میں لکھی گئی ہیں۔شمالی ہند میں افضل جھنجھانوی کی بکٹ کہانی کو (جو کہ ایک بارہ ماسہ کے طرز پر لکھی گئی ہے) پہلی مثنوی تسلیم کیا جاتا ہے۔میرؔ اور سوداؔ نے بھی قابل ذکر مثنویاں لکھی ہیں۔میرؔ کی عشقیہ مثنوی دریائے عشق کا موضوع عشق کی ایک ایسی داستان ہے جس کا انجام عاشق اور محبوب کے دریا میں ڈوب مرنے پر ہوتا ہے۔عشق اور شعلۂ عشق بھی میرؔ کی مثنوی ہے۔اسی طرح میرؔ کی ایک اور مثنوی اژدرنامہ ہے جس کے کردار دوسرے شعرا ہیں جو کہ چوہا، مینڈک، لومڑی اور چھپکلی ہیں اور میرؔ 'اژدر' 'اژدہا' ہیں۔ میر کی مثنویوں میں دنیا کی بے ثباتی اور حالات کی نارسائی کا بیان ہے۔سوداؔ کی مثنویوں میں 'پسر شیشہ گرو زرگر پسر' ایک عشقیہ داستان ہے۔ اسی دور میں 'بحرالمحبت' ایک اہم مثنوی مانی جاتی ہے۔

خواجہ میر دردؔ کے بھائی میر اثرؔ نے بھی ایک مثنوی 'خواب و خیال' کے نام سے تصنیف کی ہے جو معشوق کی سراپا

نگاری کا اچھا نمونہ ہے۔اس میں ہجر اور تمنائے وصال کا بھی ذکر ہے۔اس مثنوی کی زبان کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا:

> جدید اردو زبان کی جب سے بنیاد پڑی ہے شاید ہی کوئی مثنوی زبان کی سلاست اور روانی، فصاحت اور شیرینی، روزمرہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی زنانے اور مردانے محاوروں کے بے تکلف استعمال میں مثنوی خواب وخیال کا مقابلہ کرسکتی ہے۔

شمالی ہند میں سب سے بہترین مثنوی میر حسن کی 'سحرالبیان' ہے۔میر حسن نے مثنوی سحرالبیان ۱۱۹۹ ہجری ۱۷۸۴ء میں تصنیف کی۔میر حسن نے کل گیارہ (۱۱) مثنویاں لکھی ہیں جن میں 'سحرالبیان' میر حسن کی شاہکار مثنوی ہے۔یہ ایک ایسی مثنوی ہے جس نے ادب کی تاریخ میں اپنے مصنف کا نام زندہ و جاوید کر دیا۔اس مثنوی میں شہزادہ بے نظیر اور شہزادی بدر منیر کی عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔اس کا ذکر آگے تفصیل سے آئے گا۔

شمالی ہند ہی نہیں بلکہ اردو بان وادب کی تاریخ میں پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی 'گلزار نسیم' قابل تعریف مثنوی ہے۔یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے جو کہ لکھنو میں لکھی گئی تھی۔یہ مثنوی لکھنوی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔جس کو نسیم نے ۱۸۳۸ء میں لکھا تھا۔اس میں تاج الملوک اور گل بکاؤلی کی عشقیہ داستان کا بیان ہے۔اس کا ذکر بھی آگے تفصیل سے آئے گا۔

گلزار نسیم کے بعد قلق کی مثنوی 'طلسم الفت' اور واجد علی شاہ کی مثنوی 'حزن اختر' قابل ذکر ہیں۔

اس دور میں حکیم تصدق حسین عرف نواب مرزا شوق کی مثنوی 'زہر عشق' ایک اہم مثنوی ہے جو کہ لکھنو کی تہذیب کی آئینہ دار ہے، جس کے ذکر کے بغیر مثنوی کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔مرزا شوق سے پانچ مثنویاں منسوب ہیں: فریب عشق، بہار عشق، زہر عشق، لذت عشق اور خنجر عشق۔لیکن 'زہر عشق' شوق کی شہرت کا باعث بنی۔اس میں کوئی بھی فوق الفطری کردار نہیں ہے بلکہ اس میں جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے کردار ہیں جو کہ نہ تو سراپا شیطان ہیں اور نہ ہی سراپا فرشتے بلکہ وہ تو بشری خصوصیات کے حامل کردار ہیں۔

اس کے ہیرو مرزا شوق خود ہیں۔ان کو پڑوسی سوداگر کی بیٹی ماہ جبیں سے عشق ہو جاتا ہے۔دونوں چھپ چھپ کر ملنے لگتے ہیں اور جب بھید کھل جاتا ہے تو دونوں بدنامی کے ڈر سے زہر کھا لیتے ہیں، جس میں لڑکا تو بچ جاتا ہے لیکن لڑکی جان دے دیتی ہے۔اس مثنوی میں جذبات نگاری بہت اچھی کی گئی ہے۔دنیا کی بے ثباتی کا بیان اثر انگیز ہے۔'زہر عشق' اپنی عریانی کے عیب کے باوجود بہترین مثنوی میں شمار کی جاتی ہے۔

حالی اور آزاد نے انجمن پنجاب کے مشاعروں کی بنیاد ڈالی تو مثنویوں کے موضوع بدل گئے۔عشقیہ داستانوں کے بجائے اب مناظر فطرت اور حب الوطنی مثنویوں کے موضوع بنے۔اس سلسلے میں حالی کی حب وطن، مناجات بیوہ، آزاد کی خواب امن اور شبلی کی صبح امید اسی قبیل کی مثنویاں ہیں۔علامہ اقبال نے بھی کئی مثنویاں لکھی ہیں۔ان کی مثنویوں میں سید کی لوح تربت، ساقی نامہ، انسان اور بزم قدرت، رخصت اے بزم جہاں اہم ہیں، لیکن ان میں ساقی نامہ سب سے اعلیٰ درجے کی مثنوی ہے۔

سردار جعفری کی 'جمہوریہ'، کیفی اعظمی کی 'خانہ جنگی'، جوش کی مثنوی 'جنگل کی شہزادی'، 'جمنا کنارے' اور 'بیوہ سہاگن' بڑی دلکش اور پرتاثیر مثنویاں ہیں۔حفیظ جالندھری کی مثنوی 'شاہ نامہ اسلام' اس دور کی طویل مثنوی ہے۔

1.6 مثنوی کی اہمیت

مثنوی ہیئت کے اعتبار سے بیانیہ نظم ہے، قافیہ کی گنجائش کے باعث اس میں تفصیل سے کوئی بھی بات کہی جاسکتی ہے۔ اسی لیے اردو شعرا نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے اور طویل داستانوں کو مثنوی کا جامہ پہنایا ہے۔

مثنویوں میں عشق و محبت کے موضوع کے علاوہ عجیب و غریب واقعات اور فوق الفطری کردار، مذہب، اخلاق اور سماجی و معاشی حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، مثنویوں میں خارجی ماحول حاوی نظر آتا ہے۔

مثنویوں نے زبان و بیان کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے اور زبان کے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں۔

خود جانچنے کے سوال

(۱) جس صنف میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں وہ صنف کیا کہلاتی ہے؟

(۲) مثنوی کے اہم موضوعات بتائیے۔

(۳) قطب مشتری کس کی تصنیف ہے؟

(۴) مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے مصنف کا نام بتائیے۔

(۵) ارشادنامہ کس نوعیت کی مثنوی ہے؟

(۶) نصرتی کی مثنوی گلشن عشق کا موضوع کیا ہے؟

(۷) بدر منیر کس مثنوی کا کردار ہے؟

(۸) نسیم کی مثنوی گلزار نسیم کی کوئی ایک خوبی بیان کیجیے۔

(۹) مثنوی سحر البیان کے شاعر کا کیا نام ہے؟

(۱۰) مثنوی سحر البیان کا سنہ تصنیف بتائیے۔

(۱۱) مثنوی گلزار نسیم کے ہیرو کا نام بتائیے۔

(۱۲) حالؔی کی دو مثنویوں کے نام لکھیے۔

(۱۲) مثنویوں میں کس طبقے کی معاشرت پیش کی گئی ہے؟

(۱۳) علی نامہ کس نوعیت کی مثنوی ہے؟

(۱۳) میرؔ نے کس مثنوی میں اپنے آپ کو اژدر کہا ہے؟

(۱۴) مثنوی زہر عشق کس کی تصنیف ہے؟

1.7 خلاصہ

اس سبق میں ہم نے مثنوی کا فن، مثنوی کے اجزا اور مثنوی کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے۔

1.8 نمونہ برائے امتحانی سوالات

(۱) مثنوی کی تعریف بیان کیجیے۔
(۲) مثنوی کے اجزائے ترکیبی بیان کیجیے۔
(۳) دکن کی مشہور مثنویوں کے نام بتائیے۔
(۴) قطب مشتری کی اہمیت کو واضح کیجیے۔
(۵) شمالی ہند میں اردو مثنوی کی تاریخ بیان کیجیے۔
(۶) مثنوی میں معاشرت نگاری پر تبصرہ کیجیے۔
(۷) دکن اور شمالی ہند کی مثنویوں کے موضوعات پر روشنی ڈالیے۔

1.9 معاون کتب

۱۔	اردو مثنوی کا ارتقا	پروفسر عبدالقادر سروری
۲۔	تاریخ ادب اردو	نورالحسن نقوی
۳۔	اردو مثنوی شمالی ہند میں	گیان چند جین
۴۔	دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا	عبدالقادر سروری
۵۔	مثنوی سحرالبیان	مرتبہ قمرالہدیٰ فریدی
۶۔	اردو کی تین مثنویاں	خان رشید

اکائی 2 انتخاب سحرالبیان (میرحسن)

اکائی کے اہم اجزا

2.1 اغراض ومقاصد

2.2 تمہید

2.3 میرحسن کا تعارف

2.4 مثنوی سحرالبیان کی خصوصیات

2.5 سحرالبیان کا خلاصہ

2.6 متن: انتخاب سحرالبیان

2.7 انتخاب سحرالبیان کی تشریح

2.8 خلاصہ

2.9 نمونہ برائے امتحانی سوالات

2.10 فرہنگ

2.11 معاون کتب

2.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں میرحسن کا تعارف، مثنوی سحرالبیان کی خصوصیات، اس کا خلاصہ اور منتخب اشعار کی تشریح کی گئی ہے۔ اس اکائی کو پڑھ لینے کے بعد طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ:

☆ میرحسن کا مختصر تعارف کرا سکیں

☆ مثنوی سحرالبیان کی فنی وادبی خصوصیات بیان کرسکیں

☆ مثنوی سحرالبیان کے منتخب حصے کی تشریح کرسکیں۔

2.2 تمہید

پہلے سبق میں ہم نے مثنوی بہ حیثیت صنف سخن بہت سی معلومات حاصل کی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ مثنوی کو دکن میں بہت زیادہ فروغ ملا کہ دکن کی شاعری کو مثنوی کا سنہرا دور کہا جاتا ہے، دکن میں قطب مشتری، گلشن عشق، اور پھول بن جیسی قابل قدر مثنویاں تصنیف کی گئی ہیں۔

یہ مثنویاں عجیب وغریب اور محیر العقول واقعات سے بھری پڑی ہیں، ان کو پڑھنے میں بڑا مزا آتا ہے اور جو کچھ بھی ہم اس دنیا میں حاصل نہ کر سکے وہ مثنوی کے ہیرو کے ذریعہ سے حاصل ہوتا دیکھ سکتے ہیں۔ ہیرو کی مدد مافوق الفطرت کردار کرتے ہیں اس کو پڑھنے والے حظ حاصل کرتے ہیں، ان مثنویوں جہاں پر دلچسپی کے بہت سارے سامان ہوتے ہیں وہیں ادبی ذوق کی بھی تسکین ہوتی ہے، مثنویوں میں ہماری تہذیب زندہ ہے زبان و بیان کے پیرائے اور شعری محاسن وغیرہ مثنویوں کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں، تہذیب وتمدن، ہماری معاشی اور معاشرتی زندگی کی عکاسی، مذہبی عقائد، قومی یکجہتی، اور یہاں کی گنگا جمنی تہذیب مثنویوں کا جزلاینفک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان مثنویوں کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

اگر آپ مثنوی سحر البیان کا مطالعہ کریں گے تو آپ کی خواہش ہوگی کہ ایک ہی نشست میں آپ پوری مثنوی کا مطالعہ کرڈالیں۔ آیئے! اب ہم مثنوی سحر البیان اور اس کے مصنف کے بارے میں معلومات حاصل کریں

2.3 میر حسن کا تعارف

کہا جاتا ہے کہ میر حسن نے اگر مثنوی سحر البیان نہ لکھی ہوتی تو بھی ان کا نام تاریخ ادب میں باقی رہتا وہ اس لیے کہ وہ میر خلیق کے والد اور میر انیس کے دادا تھے، لیکن میر حسن کو اس کی ضرورت نہیں انھوں نے ایک شاہکار تخلیق کیا جو کہ خود زندہ رہے گا اور اپنے خالق کو بھی زندہ رکھے گا۔

میر حسن دہلی میں پیدا ہوئے تھے ان کے والد سوداؔ کے ہم عصر میر غلام حسین ضاحک تھے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے والد سے حاصل کی۔ دہلی اس وقت طوائف الملوکی کا شکار تھی وہ بار بار بس کر بار بار اجڑ رہی تھی۔ باہری حملوں کی باعث دہلی کے کوچے اوراق مصور بنے ہوئے تھے اور ایسے حالات میں لوگوں کو نان شبینہ میسر نہ تھا، اہل فن و اہل کمال کی حالت دگرگوں تھی۔ چنانچہ اہل کمال دہلی سے ترک سکونت کر کے ملک کے مختلف مقامات کا رخ کر رہے تھے، اہل دہلی کا رخ اودھ کی طرف زیادہ تھا یہی وجہ ہے کہ میرؔ اور سوداؔ جیسے شعراء نے بھی اودھ کی طرف رخ کیا۔ میر حسن کے والد بھی تلاش معاش کے سلسلے میں فیض آباد چلے آئے، اس وقت میر حسن کی عمر بارہ سال کی تھی۔

میر حسن کو شاعری وراثت میں ملی تھی یہ فیضان خداداد بھی تھا اس لیے میر حسن نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی اس کے ساتھ انھوں نے ایک تذکرہ بھی تصنیف کیا۔

اردو شاعری میں میر حسن اپنی لازوال تصنیف مثنوی سحر البیان کے علاوہ کئی وجوہ سے زندہ ہیں۔ میر حسن نے تقریباً گیارہ مثنویاں لکھی ہیں لیکن شہرت عام اور بقائے دوام کا تاج میر حسن کے سر پر مثنوی سحر البیان ہی نے رکھا ہے۔

مثنوی سحر البیان کا سن تصنیف ۸۵-۱۷۸۴ء تسلیم کیا جاتا ہے، میر حسن نے اپنی اس تصنیف پر بڑا فخر کیا ہے اور اپنی نام وری کا ذریعہ قرار دیا ہے کہ

رہے گا جہاں میں مرا اس سے نام کہ ہے یادگار جہاں یہ کلام

میر حسن کی شہرت اور مقبولیت کی وجہ مثنوی سحر البیان ہے۔ اس دور میں میر حسن نے مربوط اور باکمال مثنوی لکھ کر ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی میں کئی مثنویاں لکھی گئیں۔

2.4 مثنوی سحر البیان کی خصوصیات

مثنوی سحر البیان کی کہانی سیدھی اور سپاٹ ہے لیکن میر حسن نے ڈرامائی انداز اپنایا، اس کے علاوہ منظر نگاری اور جذبات نگاری کی کامیاب عکاسی کی ہے۔ اس میں شاعر نے خیالی کرداروں کو لکھنو کے جاگیردارانہ نظام کے نواب زادوں کو حقیقی انداز میں ڈھال کر پیش کیا ہے اور ان کے احساسات و جذبات نیز نفسیات کے بیان کا حق ادا کر دیا ہے۔

لکھنو کی تہذیب میں محفل کی آرائش پر خاصی توجہ دی جاتی تھی اور مثنوی سحر البیان میں میر حسن نے اس کا خاص اہتمام کیا ہے، یہ مثنوی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں لکھنو کی تہذیب جلوہ گر ہے، اس میں سارے کردار چلتے پھرتے اور باتیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ان میں سے کچھ کردار تو زندہ و جاوید ہو گئے ہیں جیسے نجم النساء کا کردار ایک متحرک اور فعال کردار ہے جو کہ ادب میں زندہ کردار ہے۔

جزئیات نگاری اس مثنوی کا نمایاں وصف ہے جذبات اور احساسات کا بیان بہت مفصل انداز میں کیا گیا ہے، مختلف فنون، صنعتوں اور پیشوں کی اصطلاحات مفصل بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً نجوم، موسیقی، رسم الخط، پھولوں، زیورات، سواریوں وغیرہ کی اصطلاحات کا بیان نہایت مفصل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مثنوی سحر البیان کی شاہ کاری اس کی سحر البیانی کی وجہ سے ہے، الفاظ کی صنعت گری، رعایت لفظی، میر حسن کی طرز نگارش کا بہترین نمونہ ہے۔ میر حسن نے مثنوی سحر البیان صاف اور بامحاورہ زبان میں تصنیف کی ہے جس کی وجہ سے اس کے کئی اشعار ضرب المثل بن گئے ہیں مثلاً

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں — گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن — جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن

یہ مثنوی دہلی اور لکھنو کی تہذیب کا مشترکہ ورثہ کہلاتی ہے اس میں دلی جذبہ، سچائی اور تأثیر ہے ساتھ ہی ساتھ اس میں کاریگری اور صنعت پروری بھی ہے، اس مثنوی کی خصوصیات کو سمجھنے کے لیے ذیل میں چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ باغ کی آرائش و زیبائش کا بیان

عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان — لگے جس میں زربفت کے سائبان
چھتیں اور پردے بندھے زرنگار — دروں پر کھڑی دست بستہ بہار

۲۔ باغ کا منظر

گلوں کا لب نہر پر جھومنا — اسی اپنے عالم میں منھ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر — نشے کا سا عالم گلستان پر

نہر کے کنارے بہار کا خوبصورت منظر بیان کیا ہے پھول جھوم رہے تھے اور ایک دوسرے کے منھ چوم رہے تھے، حسن تعلیل کا بیان کیا ہے درخت پاس پاس اس طرح کھڑے ہیں کہ ان کی شاخیں لپٹی ہوئی محسوس ہوتی ہیں جس طرح سے عموماً نشے

میں احباب ایک دوسرے کی گردن میں بانہیں ڈال کر اپنائیت کا اظہار کرتے ہیں۔

۳۔ خواضوں اور کنیزوں کا بیان

کنیزاں مہ رو کی ہر طرف ریل — چنبیلی کوئی اور کوئی لائے بیل
شگوفہ کوئی اور کوئی کام روپ — کوئی چت لگن اور کوئی شیام روپ

ان اشعار میں مختلف کنیزوں کے نام نظر آتے ہیں اور یہ نام پھولوں کے ناموں پر ہیں، یہ ساری کنیزیں چمکتے دمکتے چہروں والی ماہ رو ہیں یہاں پر ان کی ریل پیل ہے، چنبیلی، شگوفہ، کام روپ، چت لگن، اور شیام روپ وغیرہ ان کے نام ہیں۔

۴۔ بدر منیر بے نظیر کی جدائی کے عالم میں بے قرار ہے

دوانی سی ہر سمت پھرنے لگی — درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا — نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا

بے نظیر کو ماہ رخ نے ایک کنویں میں قید کر دیا تھا تو بدر منیر کی ایسی حالت ہوگئی کہ وہ ہنسنا بولنا کھانا پینا سب بھول گئی۔

۵۔ مکالمہ نگاری ملاحظہ ہو

کہا گر کسی نے کہ کچھ کھایئے — کہا خیر بہتر ہے منگوایئے
کہا مجھ سے پیاری نہ بیزار ہو — پھر آ وں گا بولی وہ مختار ہو

میر حسن زبان کے ماہر تھے لکھنوی اور دہلوی زبان ان کے گھر کی لونڈی تھی دہلی کی سادگی اور لکھنو کی پرکاری ان کی زبان کا امتیازی وصف ہے۔ بہر حال میر حسن نے سحر البیان میں بیان پر توجہ مرکوز کی اور اسی لیے اس کا نام سحر البیان رکھا ہے، اس مثنوی کی تصنیف کو تقریباً دو سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی زبان و بیان اور تہذیب و معاشرت کی عکاسی کے اعتبار سے یہ مثنوی بے مثل مانی جاتی ہے۔

2.5 سحر البیان کا خلاصہ

مثنوی سحر البیان میر حسن کی شاہکار مثنوی ہے۔ آیئے اب اس کی کہانی سے متعارف ہوتے ہیں۔

اس مثنوی کو مروجہ اجزاء کی پابندی کے تحت حمد، نعت، منقبت، اور فرمانروائے وقت کی تعریف کرتے ہوئے اپنی ناموری کا ذریعہ قرار دیا ہے، اور اس کے بعد قصہ شروع ہوتا ہے۔ اس میں بادشاہ وقت کی پریشانی کی وجہ اولاد نہ ہونا قرار دیا ہے۔ تبھی نجومی اور رمال اولاد ہونے کی پیشن گوئی کرتے ہیں اور جب اولاد پیدا ہوتی ہے تو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شہزادے کو بارہ سال تک خطرہ درپیش ہے اس لیے اس کو باہر نہ نکالا جائے۔

شہزادہ بے نظیر تولد ہوتا ہے تو اس کی پرورش پوری حفاظت کے ساتھ کی جاتی ہے، یہ مان کر کہ اس کے بارہ سال مکمل ہو گئے ہیں خوشی کے اظہار کے لیے جلوس کی تیاریاں ہوتی ہیں شہزادے کو نہلا دھلا کر لباس فاخرہ زیب تن کرایا جاتا ہے۔ بڑی شان و

شوکت کے ساتھ جلوس نکلتا ہے جلوس سے واپس آنے کے بعد شہزادہ کھلی چھت پر چاندنی رات میں سونے کی خواہش کرتا ہے اور بادشاہ اس کو اجازت دے دیتا ہے لیکن بارہ سال کا وقت پورا ہونے میں ابھی ایک دن باقی تھا چنانچہ جب شہزادہ کھلی چھت پر سو رہا تھا تو اس طرف سے ماہ رخ پری کا گزر ہوا وہ شہزادے بے نظیر کے بے نظیر حسن پر فریفتہ ہوگئی اور سوتے ہوئے شہزادے کو پرستان لے گئی۔

جب شہزادے کی آنکھ کھلی تو وہ پری کے گھر قید تھا، دن بھر پری بے نظیر کے ساتھ رہتی اور رات کو وہ اپنے والدین کے پاس چلی جاتی تھی، شہزادہ بے نظیر کا دل وہاں پر گھبراتا تھا اس لئے پری اس کو کل کا گھوڑا لا کر دیتی ہے اور اس گھوڑے پر شہزادہ سیر کو جانے لگا ایک رات شہزادہ بے نظیر شہزادی بدر منیر کے باغ میں پہنچ گیا دونوں کی ملاقات ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو گئے۔

اس طرح سے ہر رات دونوں کی ملاقاتیں ہونے لگیں جب ان ملاقاتوں کا پتا ایک دیو کے ذریعہ سے پری کو چلتا ہے تو وہ غصہ میں بے نظیر کو ایک کنویں میں قید کر دیتی ہے۔

بدر منیر ہر رات شہزادے کا انتظار کرتی ہے اور اس کے فراق میں وہ تڑپتی ہے ایک رات وہ خواب میں شہزادے کو کنویں میں قید دیکھتی ہے۔ شہزادی کی سہیلی نجم النساء (جو کہ وزیر زادی ہے) سے بدر منیر کی حالت نہیں دیکھی جاتی ہے اور وہ جوگن کا بھیس بنا کر شہزادے کی تلاش میں نکلتی ہے اور جب وہ بین بجاتی ہے تو جن کا بیٹا فیروز شاہ اس پر عاشق ہو جاتا ہے، نجم النساء اس کی مدد سے شہزادے کو پری کی قید سے آزاد کراتی ہے۔

آخر میں سب مل جاتے ہیں اور بے نظیر کی شادی بدر منیر سے اور نجم النساء کی شادی فیروز شاہ سے ہو جاتی ہے۔ مثنوی کا انجام خوش گوار ہوتا ہے اور شاعر آخر میں سب کے لیے دعا کرتا ہے۔

2.6 متن: انتخاب سحر البیان

مئے ارغوانی پلا ساقیا — کہ تعمیر کو باغ کی دل چلا
دیا شہ نے ترتیب اک خانۂ باغ — ہو رشک سے جس کے لالہ کو داغ
عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان — لگے جس میں زربفت کے سائبان
چقیں اور پردے بندھے زرنگار — دروں پر کھڑی دست بستہ بہار
کوئی دور سے در پہ اٹکا ہوا — کوئی زہ پہ خوبی سے لٹکا ہوا
وہ مقیش کی ڈوریاں سر بسر — کہ مہ کا بندھا جن میں تار نظر
چقوں کا تماشا تھا آنکھوں کا جال — نگہ کو وہاں سے گزرنا محال
سنہری مفرق چھتیں ساریاں — وہ دیوار اور در کی گل کاریاں
دیئے چار سو آئینے جو لگا — گیا چوگنا لطف اس میں سماں
وہ مخمل کا فرش اس میں ستھرا کہ بس — بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس

2.7 تفہیم اشعار

میر حسن نے اپنی مثنوی کے ہر جزو کی ابتداء خمریات کے شعر سے کی ہے وہ ساقی سے شراب طلب کرتے ہیں، یہ تمہید ہو تی ہے۔اس شعر سے پتا چلتا ہے کہ اس جزو کا موضوع کیا ہوگا جیدے خانۂ باغ کی ترتیب کے جزو کی ابتداء میر حسن اس طرح کرتے ہیں کہ

۱۔ اے ساقی تو مجھے ارغوانی شراب پلا۔یعنی سرخ اور عمدہ شراب تا کہ میں اس شراب کے جوش میں خانۂ باغ کی تعمیر کر سکوں۔ شراب کے لیے ارغوانی کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ باغ کی تعمیر کرنا ہے اور باغ میں سرخ رنگ کے یا پھر رنگ برنگے پھول کھلتے ہیں اس لیے ارغوانی شراب کی خواہش کی گئی ہے۔ ارغوانی شراب پھولوں کی نسبت سے مانگی گئی ہے اس میں سادگی اور فن کاری کا بہترین امتزاج ہے۔

۲۔ شاہ نے خانۂ باغ کی تعمیر کا حکم دیا اور باغ کی آراستگی اور خوبصورتی کے باعث لالہ کے جگر میں داغ ہو گیا

لالہ کے پھول میں سیاہ داغ ہوتا ہے وہ خانہ باغ کی دل کشی اور سجاوٹ کو دیکھ کر جو رشک ہوا ہے وہ داغ اسی وجہ سے ہوا ہے۔اس شعر میں صنعت حسن تعلیل ہے یعنی اس کی وجہ تو کچھ اور ہو لیکن شاعر نے اس کے اندر کچھ اور (علت) بیان کی ہے اس کی حسن تعلیل کہتے ہیں۔ یہاں پر میر حسن لالہ کے داغ کی وجہ وہ رشک بتا رہے ہیں جو کہ باغ کے حسن کو دیکھ کر پیدا ہوا ہے۔

۳۔ باغ کی عمارت پر شکوہ ہے اور تعمیر کا اچھا نمونہ ہے، دروازے شان دار اور بلند ہیں اور اس کے اندر لگے ہوئے شامیانے میں جو کپڑا استعمال ہوا ہے وہ سونے چاندے کے تاروں سے بنا ہوا ہے۔ایسے کپڑے کو زربفت کہا جاتا ہے اس کی چمک دمک اس عمارت کی شان و شوکت میں اضافہ کر رہی ہے

۴۔ دروازے پر پڑی ہوئی چقیں سونے چاندی کے تاروں سے بنائی ہوئی ہیں جو کہ نقش و نگار سے سجی ہوئی ہیں چاروں طرف خوبصورت منظر ہے جس کی وجہ سے ایسا لگتا ہے کہ بہار اس کے لیے ہاتھ باندھے باادب کھڑی ہے۔

۵۔ دروں پر سجاوٹ کی گئی ہے اور کارنس پر آراستگی کی گئی ہے۔آج کل بھی سجاوٹ اسی طرح سے کی جاتی ہے کہ دروں دروازوں اور کارنس پر قسم قسم کی سجاوٹی اشیاء کا استعمال کیا جاتا ہے تو پھر اس دور میں بھی کیا جاتا ہوگا۔ یہاں پر میر حسن نے اس طرح سے بیان کیا ہے کہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے اور پڑھنے والا اس کے اندر کھو کر رہ جاتا ہے۔

۶۔ اس شعر میں ایک خوبصورت نظارے کی منظر کشی کی گئی ہے، شاعر کہتا ہے کہ سونے چاندی کے تاروں کی جھالر (کرن بیل) ایک سرے سے دوسرے سرے تک لگائی گئی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چاندی چمک رہی ہے یعنی کرن بیل کی لشکارے پڑے ہی خوبصورت اور دلکش محسوس ہوتے ہیں۔

۷۔ اس شعر میں چقوں کا نگاہوں کا جال کہا ہے پلکوں اور چقوں کے دروازوں میں یکسانیت ہے اسی وجہ سے پلکوں کو چقوں سے تشبیہ دی ہے، اسی طرح سے اس شعر میں رعایت لفظی کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔آنکھ، تماشا اور نگاہ کا ذکر رعایت لفظی کی صنعت کو ظاہر کرتا ہے۔

اس شعر کی تشریح اس طرح سے کی جاسکتی ہے کہ خوبصورت چقیں سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا رہی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شکاری کے جال میں پرندے پھنس گئے ہیں یعنی چقوں پر پڑنے والی نگاہیں جال میں الجھ گئی ہوں۔

۸۔ چھتوں پر سونے چاندی کی پالش کی گئی ہے، جس کی وجہ سے چھت جگمگا رہی ہے اسی کے ساتھ دیوار اور در پر بھی بیل بوٹے دیکھنے کے قابل ہیں۔

۹۔ چاروں طرف آئینے ہی آئینے آویزاں ہے جس کی وجہ سے اس عمارت کا حسن بڑھ گیا ہے۔

۱۰۔ عمارت میں مخمل کا فرش بچھا ہوا ہے اور جس کی وجہ سے قدم بار بار رک جاتے ہیں اور نرم فرش پر خواہش کے قدم بھی آگے بڑھتے ہوئے جھجھک محسوس کرتے ہیں۔

2.8 خلاصہ

۱۔ اس سبق میں ہم نے مثنوی سحر البیان کے متعلق ہر گوشے کا جائزہ لیا ہے۔

۲۔ ہم نے میر حسن کے حالات زندگی، مثنوی سحر البیان کا اور اس کی شعری خصوصیات کا مطالعہ کیا ہے۔

۳۔ اس کے اشعار کی تفہیم، معانی اور مطالب کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

2.9 نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالات کے جواب ۳۰ سطروں میں دیں۔

۱۔ میر حسن کون تھے؟ ان کے مختصر حالات زندگی تحریر کیجیے اور ان کی مثنوی نگاری کی خصوصیات بھی بتائیے۔

۲۔ مثنوی سحر البیان کا خلاصہ لکھیں۔

۳۔ اشعار نمبر ۱۔۲۔۵۔۷ کی تشریح کیجیے۔

2.10 فرہنگ

ساقیا	شراب پلانے والا	دست بستہ	ادب سے ہاتھ باندھے ہوئے
مقیش	ایسی جھالر جو کہ سونے چاندی کے تاروں سے بنی ہوئی ہو	زہ	کنارہ
سربہ سر	ایک سرے سے دوسرے سرے تک	مئے	شراب
ارغوانی	سرخ رنگ کی	مہ	چاند
مئے ارغوانی	سرخ شراب، نہایت اعلیٰ درجے کی شراب	مفرق	جگمگانا یا ڈوبا ہوا
خانۂ باغ	مکان میں شامل چہار دیواری والا باغ	محال	مشکل

رشک خوبصورتی یا اچھائیوں کو دیکھ کر پیدا شدہ جذبہ

ساریاں ساری، سب (اب یہ لفظ ساریاں استعمال نہیں ہوتا ہے متروک ہو چکا ہے)

لالہ سرخ پھول جس میں کالا داغ ہوتا ہے

زربفت ایسا کپڑا جس کی بنائی میں چاندی سونے تاروں کا استعمال ہوتا ہے

چق	بانس کی پتلی تیلی سے بنا ہوا پردہ	چارسو	چاروں طرف
زرنگار	سنہری نقش بنے ہوئے	گل کاریاں	گل بوٹے، نقاشی
دروں پر	دروازوں پر	ہوس	خواہش یا شوق

2.11 معاون کتب

۱۔ اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ ادریس صدیقی

۲۔ اردو شاعری پر ایک نظر (حصہ اول) کلیم الدین احمد

۳۔ اردو مثنوی کا ارتقا پروفیسر سید عقیل رضوی

۴۔ مثنوی سحر البیان مرتبہ قمر الہدیٰ

اکائی 3 انتخاب گلزار نسیم (دیا شنکر نسیم)

اکائی کے اہم اجزا

3.1 اغراض ومقاصد

3.2 تمہید

3.3 شاعر کا تعارف

3.4 مثنوی گلزار نسیم اور اس کا اسلوب

3.5 گلزار نسیم کے منتخب اشعار اور ان کی تشریح

3.6 خلاصہ

3.7 نمونہ برائے امتحانی سوالات

3.8 فرہنگ

3.9 معاون کتب

3.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں پنڈت دیا شنکر کا تعارف، ان کے زبان واسلوب کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ مثنوی گلزار نسیم کے منتخب اشعار اور ان کا خلاصہ بھی دیا گیا ہے۔

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبہ سے اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ

- ☆ پنڈت دیا شنکر نسیم کا تعارف کرا سکیں۔
- ☆ پنڈت دیا شنکر نسیم کے اسلوب اور زبان کا جائزہ لے سکیں۔
- ☆ مثنوی گلزار نسیم کی خصوصیات بیان کر سکیں۔
- ☆ اشعار کا خلاصہ اور ان کا مطلب بھی بیان کر سکیں۔

3.2 تمہید

پچھلی اکائی میں آپ نے میر حسن اور ان کی مثنوی 'سحر البیان' کے بارے میں جانکاری حاصل کی ہے۔ اس اکائی میں ایک اور مشہور مثنوی نگار پنڈت دیا شنکر نسیم اور ان کی مشہور مثنوی 'گلزار نسیم' کے بارے میں جان سکیں گے۔

3.3 شاعر کا تعارف

گلزار نسیم کے شاعر کا نام پنڈت دیا شنکر کول ہے۔ وہ گنگا پرساد کے بیٹے تھے۔ لکھنو ہی میں ہی رہتے تھے اور ان کا تعلق معزز کشمیری خاندان سے تھا۔ ان کی پیدائش ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئی اور وفات ۱۸۴۵ء میں۔ انھوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں تعلیم حاصل کی تھی لڑکپن سے ہی شعر کہنا شروع کیا۔ امجد علی بادشاہ کی فوج میں وہ بخشی کے عہدے پر فائز تھے اور وہ آتش کے شاگرد تھے، انھوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی، ان کا ایک مختصر سا دیوان بھی ہے جس میں غزلوں کے علاوہ ترجیع بند بھی ہیں، دیا شنکر کی غزلوں میں ان کے استاد یعنی آتش کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور خودداری ان کے پسندیدہ موضوع ہیں، ان کی زبان پر لکھنو کا رنگ غالب ہے، رعایت لفظی اور صنائع کے باوجود معنویت اور پاکیزگی کو بھی پورا خیال رکھنا یہ ان کا خاص وصف ہے، کلام میں برجستگی اور اختصار سے خوبی پیدا کر دیتے ہیں۔

3.4 مثنوی گلزار نسیم اور اس کا اسلوب

گلزار نسیم اردو کی مشہور مثنوی ہے، گلزار نسیم ایک طویل مثنوی تھی لیکن نسیم نے اپنے استاد آتش کے کہنے پر اس کو مختصر کر دیا، گلزار نسیم اردو ادب کے خزانے میں ایک انمول رتن کی حیثیت رکھتی ہے۔ گلزار نسیم (۳۹-۱۸۳۸ء) میں لکھی گئی اور یہ ۱۸۴۴ء میں شائع ہوئی تھی گلزار نسیم میں گل بکاؤلی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے مترجم نہال چند لاہوری نے اسی قصہ کو نثری شکل میں فارسی سے اردو میں منتقل کیا ہے نسیم نے اس کو نظم کی شکل دی۔ دراصل یہ قصہ فارسی نثر میں عزت اللہ بنگالی نے لکھا تھا۔

گلزار نسم میں تشبیہ و استعارات کی کثرت، لفظی اور معنوی رعایت اور کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہہ کر ایسا جادو جگایا ہے کہ چھوٹی سی کہانی میں مختلف معنوی امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔

مثنوی گلزار نسیم کو دبستان لکھنو کی شاعری کا ایک مثالی نمونہ کہا جاتا ہے دیا شنکر کے زمانے میں لکھنو کی شاعری میں جو شائستگی، مرصع کاری، اور تکلفات کا رواج تھا وہ گلزار نسیم میں پوری طرح سے نظر آتے ہیں۔

دیا شنکر نے نثری قصے کی تفصیلات کو نظم میں بہت اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے، انھوں نے صنائع لفظی خاص طور پو رعایت لفظی کو اپنا شیوہ بنایا ہے اور ان کے سلیقے نے اس کو معنی آفرینی کا ایک انداز بنا دیا ہے لفظوں کی رعایت کو اس طرح سے ملحوظ رکھا ہے کہ اس التزام سے پہلو دار انداز کی تشکیل ہو جس میں معنویت کی تہہ ہوں اور پھر ان پہلو دار لفظوں کو ایسی چست بندش کے سانچے میں ڈھالا کہ شعر بولتے ہوئے پیکر بن گئے، اس معنوی تہہ داری اور چست بندش کے فیض سے مثنوی گلزار نسیم کے بہت سے اشعار ضرب المثل کی طرح دہرائے جاتے ہیں، یہ بات کسی مبالغہ کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ نسیم نے بڑی مہارت اور سلیقے کے ساتھ اشعار کو شیشے میں اتارا ہے۔ اردو میں کوئی دوسری اتنی طویل نظم شاید ہی پیش کی جا سکے جس میں چند مقامات کو چھوڑ کر رعایت لفظی سے اشعار میں ایسے پہلو داری پیدا کی گئی ہو۔

دیا شنکر نے جتنے بھی الفاظ ضروری سمجھے اتنے ہی الفاظ کا استعمال کیا ہے انھوں نے مفہوم کو سمجھانے کے لیے کم سے کم الفاظ کا ستعمال کیا ہے بندش کی چستی کے رنگ کو مدھم نہ پڑنے دیا انھون نے اس بات کا بھی خیال رکھا کہ نظم میں اشعار کے

اختصار کی وجہ سے اشعار کا لطف بھی کم نہ ہونے پائے۔ان کے اشعار چستی اور بندش کی وجہ سے اردو شاعری میں نمونوں کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

گلزار نسیم اگر مختصر ہونے کے بجائے طویل ہوتی تو اس کے اندر بھدا پن آنے کا امکان تھا، دیا شنکر نسیم نے اس مثنوی کو حسن و بیان اور حسن و قبول دونوں بخشے ہیں، گلزار نسیم میں جذبات نگاری، جزئیات نگاری کی عکاسی اور مناظر کی تصویر کشی مقصود ہے، اس کے اشعار میں چمک ہے، دل کشی ہے، لیکن تاثیر کی گرمی نہیں، گلزار نسیم نے مثنوی نگاری میں ایک نئے انداز کا اضافہ کیا ہے جو کہ اس سے قبل متعارف نہ تھا۔ ویسے تو یہ اس طرز کی منفرد مثنوی ہے اس مخصوص اور محدود دائرے میں اس میں سارے محاسن موجو دہیں جن سے اس انداز کی یکتائی کے نقش و نگار بنتے ہیں۔

اردو میں اچھا خاصا ذخیرہ ایسی داستانوں کا ہے جو کہ ہندوستانی اور ایرانی عناصر آمیز ہیں، پریاں ہوں کہ دیو، جادوگر ہوں، یا حکیم، طلسمات کا شہر ہو یا پھر انسانوں کی بستی، یورپ کا کوئی شہنشا ہو یا پھر مغرب کا کوئی شہزادہ، ان سب کے رہن سہن، رسم ورواج میں وہ سارے اجزاء خلط ملط نظر آئیں گے جو کہ ہند ایران معاشرت کی پیداوار ہیں۔

مثنوی گلزار نسیم بھی اسی ہند ایرانی داستان کی ایک کڑی ہے۔ یورپ کا ایک شہنشاہ ہے جس کے نام سے یہ قصہ شروع ہوتا ہے اور پھر پریوں کے دیس تک یہ سلسلہ پہنچتا ہے۔

3.5 گلزار نسیم کے منتخب اشعار اور ان کی تشریح

پنڈت دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم میں ان امور کو نہ صرف بوجوہ احسن نبھایا ہے بلکہ اپنی ذہانت، ذکاوت، طباعی اور فطری ذوق شعری سے رعایت لفظی اور تشبیہ و استعارہ وغیرہ کے وافر استعمال کی وجہ سے لکھنو کے آراستہ وہ پیراستہ پہلو دار انداز میں معنویت پیدا کر کے چار چاند لگا دئے ہیں، شعریت کا جوہر اپنی آب و تاب کے ساتھ موجود ہے رعایت لفظی کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں۔

مجنوں ہو اگر تو قصد لیجیے — سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجیے
سختی سہی یا کڑی اٹھائی — افتاد جو تھی پڑی اٹھائی
جو کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے — جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے
دیو آدمی بن بن کے آئے — آتے جاتے کو گھیر لائے
کیا رنگ زمانے نے اٹھائے — گل لینے کو گئے تھے داغ لائے

ان اشعار میں اردو کا محاورہ اور لکھنو کا روزمرہ اپنی تمام کمال اور خوبی کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ عام بول چال کے سیدھے سادے الفاظ اس شاعرانہ خوش سلیقگی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں کہ اشعار میں سہل ممتنع کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور تاثیر کا طلسم بندھ گیا ہے۔ ان اشعار کے خیالات کو بھی نثر میں ان سے زیادہ سلاست اور روانی سے بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔

نسیم نے فنی مہارت اور فطری ذوق شعر گوئی کی بدولت بندشوں کی چستی، ترکیبوں شگفتگی، اور روزمرہ کی عمدگی سے سینکڑوں اشعار کو ضرب المثل بنا دیا ہے، گلزار نسیم کے جتنے اشعار ضرب المثل بن گئے ہیں اتنے کسی اور تصنیف کے اشعار نہ بن سکے۔

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے
جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے

غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجئے
دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجئے

کھانے سے تھا ہمیں سروکار
اب مان زمان تو ہے مختار

انسان و پری کا سامنا کیا
مٹھی میں ہوا کا تھامنا کیا

درویش رواں رہے تو بہتر
آب دریا بہے تو بہتر

دونوں کے رہے نہ جان تن میں
کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

دیووں سے بھی لڑ سکا ہے کوئی
سائے کو پکڑ سکا ہے کوئی

تھمتا نہیں غصہ تھامنے سے
چل دور ہو ! سامنے سے

اوپر بتایا گیا ہے کہ اردو ادب کے دبستان لکھنو کے منفرد اسلوب کی تشکیل میں رعایت لفظی کے ساتھ ساتھ تشبیہ اور تشبیہ سے پیدا ہونے والے استعارہ وغیرہ کے وافر استعمال ہوا ہے۔ تشبیہ اور استعارے ہر زبان میں پائے جاتے ہیں تشبیہ دیگر صنائع کی طرح سے زبان کے صرف ظاہری حسن میں اضافہ نہیں کرتی ہے بلکہ وہ اپنے اندر معنوی خوبیوں کا ایک بڑا ذخیرہ بھی رکھتی ہے، تشبیہ سے شعر کے معنوی محاسن چمک جاتے ہیں اور اچھی تشبیہ یا اچھا استعارہ شعر کو سحر کے درجے تک پہنچا دیتا ہے، اور کلام میں نور و سرور کی کیفیت بھر دیتا ہے۔

تشبیہ کے بغیر تو اکثر بیان ادھورا اور سپاٹ دکھائی دیتا ہے، دیا شنکر کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے گلزار نسیم میں نادر نادر تشبیہوں اور استعاروں کے انبار لگا دئے ہیں۔

دن دن اسے ہو گیا قیامت
بوٹا سا بڑھی وہ سرو قامت

چلتی تو زمیں میں سرو گڑتے
باتیں کرتی تو پھول جھڑتے

وہ ناچنے کیا کھڑی ہوئی تھی
خود راگنی آ کھڑی ہوئی تھی

جاگی مرغ سحر کی غل سے
اٹھی نکہت سے فرش گل سے

گول اس کے ستوں تھے ساعد حور
چلمن ، مژگاں، چشم مخمور

مجھ سے خاطر میری اب کہاں جمع
تو بستر شعلہ میں رگ شمع

نہ کہہ لبوں سے قند گھولے
مستی نے دلوں کے عقد کھولے

کاوش پہ ہوا گہر سے الماس
غنچے نے بجھائی اوس سے پیاس

یہ پورا مکالمہ تشبیہوں اور استعاروں کے پردے میں ادا کیا گیا ہے۔

بولا کہ وہ خواب دیکھتا تھا
آتش پہ کباب دیکھتا تھا

بولی وہ کہ بتائیں تعبیر
دل سوزی کرے گا کوئی دلگیر

بولا وہ کہ رات کو افق میں
خورشید تھا آتش شفق میں

بولی وہ کہ مہر سے شب وروز
عالم میں رہوگے رونق افروز

بولا وہ کہ دیکھی اک شبستاں　　شعلہ ہوا انجمن میں رقصاں

تشبیہیں اور استعارے گلزار نسیم میں تراشے ہوئے ہیرے کی طرح سے چمک گئے ہیں۔ان تراشے ہوئے ہیروں کے کئی پہلو ہیں۔اور ہر پہلو جداگانہ رنگ ونور کا حامل ہے،نسیم نے ان ہیروں کو تراشنے میں بڑی ہی عرق ریزی اور دل سوزی سے کام لیا ہے،تشبیہوں اور استعاروں سے اس مثنوی کے بہت سے اشعار گنجینہ معنی کا طلسم بن گئے ہیں ان کو جتنی بار بھی پڑھیں گے معانی مفاہیم کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں جو کہ مسرت،بصیرت اور کیف ونشاط کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

تشبیہ واستعارہ کی وجہ سے گلزار نسیم کے بیانات میں اختصار پیدا کیا گیا ہے اور اختصار گلزار نسیم کی سب سے بڑی خوبی ہے،ایسے واقعات جو کہ بالعموم آٹھ دس اشعار میں بیان ہوتے ہیں۔نسیم نے ان کو ایک یا دو اشعار میں ادا کر دیا ہے۔اختصار ادب کا سب سے بڑا لازمہ اور سب سے بڑا حسن ہے بڑے سے بڑے مضمون کو کم سے کم الفاظ میں بیان کرنا اور اس طرح سے بیان کرنا کہ کلام کی دلکشی اور جاذبیت میں کمی واقع نہ ہو ادب کا حسن ہے۔گلزار نسیم کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ جو بات یا واقعہ جتنے اشعار میں بیان کیا گیا ہے اس سے کم اشعار و الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا ہے۔اختصار کی وجہ سے زوائد اور فنی عیوب کی گنجائش کم رہ گئی ہے۔دوسری طرف اختصار نے اس میں ایسے نادر شعری محاسن پیدا کر دئے ہیں جو اس کی عظمت اور اس کی قدر و قیمت اور لازوال شہرت کا سبب اور ضمانت ہیں۔

پوچھا کہ سبب کہا کہ قسمت　　پوچھا کہ طلب کہا کہ قناعت
توتا بن کے شجر پہ جا کر　　پھل کھا کے بشر کا روپ پا کر
پتے ، پھل ، گوند، چھال ،لکڑی　　اس پیڑ سے لے لے راہ پکڑی
کیا رنگ زمانے نے دکھائے　　گل لینے گئے تھے داغ لائے
تھمتا نہیں غصہ تھا منے سے　　چل دور ہو ! سامنے سے
وہ ناچنے کیا کھڑی ہوئی تھی　　خود راگنی آ کھڑی ہوئی تھی
چلتی تو زمیں میں سر و گڑتے　　باتیں کرتی تو پھول جھڑتے
اقرار میں تھی جو بے حیائی　　شرمائی لجائی مسکرائی
منھ پھیر کے ایک مسکرائی　　آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
چتون کو ملا کے رہ گئی ایک　　ہونٹوں کو ہلا کر رہ گئی ایک

اختصار اور رعایت لفظی کے التزام سے مثنوی گلزار نسیم میں جذبات نگاری، واقعہ نگاری، محاکات وغیرہ مثنویوں کے لازمی اجزا کے لیے گنجائش نہ رہی،اس لیے یہ مثنوی جذبات نگاری، واقعہ نگاری، اور محاکات وغیرہ سے عاری ہے یہ خیال کچھ تو ہماری سہل انگاری کی وجہ سے پیدا ہوا اور کچھ اس لیے بھی کہ مثنوی میں جذبات نگاری، واقعات نگاری اور محاکات وغیرہ کا ایک عمدہ نمونہ سحر البیان کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔اور ہر مثنوی کا جائزہ لیتے وقت سحر البیان کو معیار بنایا جاتا ہے، پہلے کہا جاچکا ہے کہ سحر البیان اور گلزار نسیم دونوں کی راہیں الگ الگ ہیں۔مزید یہ کہ کسی طرح سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ گلزار نسیم یا کسی دوسری مثنوی کی ادبی قدر و قیمت کا تعین سحر البیان کے واسطے سے کیا جائے، ہر نقاد ابتدا میں یہ کہتا ہے کہ ان دونوں کی راہیں الگ الگ

ہیں اوران دونوں کے مقابلے یا موازنے کی ضرورت نہیں ہے،لیکن ہوتا یہی ہے کہ قدم قدم پر شعوری یا پھر غیر شعوری طور پر دونوں مثنویوں کا تقابل کیا جاتا ہے۔سحرالبیان کا کینوس بڑا ہے،اس لیے میر حسن نے واقعہ کی حسب ضرورت تفصیلات اور جزئیات بیان کیں۔جب کہ گلزارنسیم کا کینوس چھوٹا ہے اوراس کی انفرادیت مداراس کے اختصاراورایجاز پر ہے۔اس لئے اس مین واقعہ نگاری اور جزبات نگاری اورمحاکات وغیرہ میں ہر جگہ اختصار سے کام لیا گیا ہے۔دیاشنکر نے چھوٹے کینوس پر جو تصویر بنائی ہے اس میں حسب ضرورت واقعہ نگاری،جذبات نگاری،اورمحاکات کا حق ادا کردیا ہے محاکات کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

منھ کو پھیر کے ایک مسکرائی — آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
چتون کو ملا کے رہ گئی ایک — ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک
اقرار میں تھی جو بے حیائی — شرمائی لجائی مسکرائی
وہ ناچنے کیا کھڑی ہوئی تھی — خود راگنی آ کھڑی ہوئی تھی
جھک جھک کے بدن چراتی آئی — رک رک کے قدم بڑھاتی آئی
دکھلائی کسی نے چشم جادو — چمکائی کسی نے تیغ آبرو
چلتی تو زمیں میں سرو گڑتے — باتیں کرتی تو پھول جھڑتے
گول اس کے ستوں تھے ساعد حور — چلمن مژگاں چشم مخمور

مندرجہ بالا اشعار میں واقعہ نگاری بھی پائی جاتی ہے،جس واقعہ کی تصویر کشی نسیم کرنا چاہتے ہیں۔اختصار کے باجود وہ واقعہ ہماری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔گلزارنسیم میں جنسیات نگاری کے نادرنمونے ملتے ہیں۔ان واقعات کو ہم کوگلزارنسیم کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

وہ شعلہ آتشیں لپک کے — بجلی سے گری چمک دمک کے
دونوں کی رہی نہ جان تن میں — کاٹو تو لہو نہیں بدن میں
شہزادے پہ اس نے مار چنگال — دریائے طلسم میں دیا ڈال
بیٹی کی طرف کیا نظارہ — جھلا کے کہا کہ خام پارہ
حرمت میں لگایا داغ تونے — کٹوائی بہار باغ تونے
تھمتا نہیں غصہ تھامنے سے — چل دور ہو! سامنے سے
رو رو کے بکاؤلی دل فگار — بولی کی خدا کو علم ہے یار
پھرتا تھا چشم دل میں میرے — دیدے مرے نقش پا ترے
مشکل مجھے اپنا تھامنا تھا — ہر وقت قضا کا سامنا تھا
سختی سہی یا کڑی اٹھائی — افتاد تھی جو پڑی اٹھائی
راجہ نے نگاہ کی غضب سے — پوچھا کہ یہ بے حیائی کب سے
بو آتی ہے آدمی کی لے جاؤ — ناپاک ہے آگ اسے دکھلاؤ

میں جا کے جلی تو غم نہیں ہائے ڈر ہے کہ نہ تجھ پہ آنچ آئے
میرے جلنے پہ خاک ڈالو تم نام نہ واں کے چلنے کا لو
بولا وہ کہ یہ نہ ہوگا مجھ سے میں دو قدم آگے ہوں گا تجھ سے

واقعہ نگاری اور جذبات نگاری دونوں کا ایک مشترکہ نمونہ دیکھئے کہ تاج الملوک گل بکاؤلی کو لے جا رہا ہے، صبح کو جب بکاؤلی بیدار ہوتی ہے تو پھول نہ پا کر اس کے دل و دماغ میں ایک صدمہ پہنچتا ہے، یہاں پر اس کی تفصیلات پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، موقع بھی نادر تھا اس لیے نسیم نے یہ تصویر تمام کمال و جمال کے ساتھ پیش کی ہے۔

گل جبیں نے وہ پھول جب اڑایا اور غنچہ صبح کھل کھلایا
وہ سبز باغ خواب آرام یعنی وہ بکاؤلی گل اندام
جاگی وہ مرغ سحر کے غل سے اٹھی نکہت سے فرش گل سے
منھ دھو کے جو آنکھ ملتی آئی پر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل
ہے ہے میرا پھول لے گیا کون ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اس پر اگر پڑا نہیں ہے بو ہو لے تو پھول اڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا کہ کدھر گیا گل سبوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل میرا تازیانہ لانا شمشاد انھیں سولی پہ چڑھانا
تھرائیں خواصیں صورت بید ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید
نرگس نے نگاہ بازیاں کیں سوسن نے زبان درازیاں کیں
پتا بھی پتے کو جب نہ پایا کہنے لگی کیا ہوا خدایا
اپنوں میں سے پھول لے گیا کون بیگانہ تھا سبزے کے سوا کون
شبنم کے سوا چرانے والا اوپر تھا کون آنے والا
جس کف میں ہو وہ گل داغ ہو جائے جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے
بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس
آنکھوں سے عزیز گل یہ میرا تھا پتلی وہی چشم حوض کا تھا
گل چیں کا جو ہاتھ ہائے ٹوٹا غنچے کے بھی منھ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار پڑا نہ تیرا جنگل مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
او باد صبا ہوا نہ بتلانا خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتانا
بلبل الو چہک اگر خبر ہے گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام — تھی سبزے سے راست موبراندام
انگلی لب جو نہ رکھ کے شمشاد — تھادم بہ خود اس کی سن کے فریاد
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا — جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا
رنگ اس کا غرض لگا بدلنے — گل برگ سے کف لگی وہ ملنے
بدلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی — دست آویز اس کے ہاتھ آئی
خاتم تھی نام کی نشانی — انسان کی دست برد جانی
ہاتھوں کو ملا کہا کہ ہیہات — خاتم بھی بدل گیا ہے بدذات
جس نے مجھے ہاتھ ہے لگایا — وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا
عریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے — کھال اس کی جو کھینچے مزا ہے
یہ کہہ کے جنون میں غضب ناک — خوب روئی لباس کو کیا چاک
گل کا سا لہو بھرا گریبان — سبزے کا تھا تار تار داماں
تھی بس کہ غبار سے بھری وہ — آندھی سے اٹھی ہوا ہوئی وہ
ہر باغ میں گھومتی پھری وہ — ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ
جس تختے میں مثل باد جاتی — اس رنگ کے گل کی بو نہ پاتی

ان بیانات کے ذریعہ نسیم جن کیفیات، واردات، اور جذبات کو ظاہر کرنا چاہتے تھے وہ بوجوہ احسن ظاہر ہو گئے ہیں اور اس انداز سے پوری تصویر ہمارے سامنے پھر جاتی ہے۔ ان اشعار کا لب ولہجہ اور تیور مختلف کیفیات سے ہم آہنگ ہے۔ جذبات کی شدت، غم وغصہ، جلال و جمال وغیرہ سب ہی کی موزوں عکاسی کی گئی ہے اس کے ساتھ یہاں پر شعریت کا جوہر بھی نہیں زائل ہوتا ہے، یہی گلزار نسیم کے اسلوب اور فن کی انفرادیت ہے، انفرادیت کی اساس شاعر کے تجربات، محسوسات، اور ان کے بیانات کے لیے مخصوص الفاظ کے انتخاب واستعمال پر قائم ہے، شاعر کی افتاد طبع، انداز فکر اور لب ولہجہ کی ساخت نیز اس کے فن کی قدر و قیمت کا تعین ان ہی امور کے پیش نظر کیا جاتا ہے۔

مثنویوں کا ایک لازمی جزو مکالمہ نگاری ہے۔ گلزار نسیم میں موقع ومحل کے مطابق مختصر اور طویل مکالمے ملتے ہیں۔ بکاؤلی گل چیں کا پتا لگا لیتی ہے، خط بھیج کر اسے بلا لیتی ہے تو اس کی ڈانٹ پھٹکار اور تاج الملوک کا جواب یہ ہوتا ہے کہ

بولی وہ پری بصد تأمل — کیوں جی تمہیں لے گئے تھے گل
کیا کہتی ہوں میں ادھر دیکھو — میری طرف اک نظر دیکھو
ہے یا نہیں یہ خطا تمہاری — فرمائیے کیا سزا ہو تمہاری
کی عرض رضا ہے جو خوشی ہو — عاشق کی سزا جو پوچھتی ہو
مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواؤ — کالے ناگوں سے مجھ کو ڈسواؤ
تلوار سے قتل کرو جو ہو منظور — ابرو کے اشارے سے کرو چور

زنداں میں جو زندہ بھیجنا ہو　　اپنے دل تنگ میں جگہ دو

بکاؤلی اندر سبھا میں ناچنے جاتی ہے۔تو دوسری شب تاج الملوک بھی خاموشی سے ساتھ ہولیتا ہے،صورت حال سے آگاہ ہونے کے بعد جب وہ اگلی صبح اٹھتا ہے تو مسکراتا ہے جو کہ بکاؤلی کو بے سبب معلوم ہوتا ہے، یہاں پر دونوں میں تمثیلی انداز اور استعاروں اور کنایوں میں جو گفتگو ہوتی ہے وہ مندرجہ ذیل ہے۔

جب پردۂ صبح ہوگیا فاش　　خنداں خنداں اٹھا وہ بشاش
اس غنچے دہن کا مسکرانا　　بے رنگ بکاؤلی نے جانا
ہنستے ہنستے کہا ہنستے کیوں ہو　　ہنستا نہیں بے سبب کوئی یوں
بولا وہ کہ خواب دیکھتا تھا　　آتش پہ کباب دیکھتا تھا
بولی وہ کہ ہم بتائیں تعبیر　　دل سوزی کریگا کوئی دلگیر
بولا وہ کہ رات کو افق میں　　خورشید تھا آتش شفق میں
بولی وہ کہ مہر سے شب و روز　　عالم میں رہوگے رونق افروز
بولا وہ کہ ایک مقام ہو تھا　　گلزار خلیل رو بہ رو تھا
بولی وہ کہ بشر ہو تم دلاؤ　　سرسبز ہو قوم آتشی پر
بولا وہ کہ دیکھی ایک شبستاں　　شعلہ ہوا انجمن میں رقصاں
بولی وہ کہ شعلہ میں پری ہوں　　جو ناچ نچاؤ ناچتی ہوں
بولا وہ کہ جب ہوا اجالا　　بخشا مہ انجمن نے ہالا
ہالا مہ انجمن کا کیا تھا　　وہ مار تھا کو گلے میں پڑا تھا
گھبرائی پری کہ ہیں یہ کیا ہے　　بولا وہ کہ ہار نو لکھا ہے
کاندھے پہ تھا جس کے رات ڈالا　　پہچانتی ہوں وہ طبلے والا
کیوں جی! یہ اکیلے شب کو جانا　　اوپر اوپر مزے اڑانا

گلزار نسیم میں رچی بسی شعریت اور تخلیقی فنی جوہر کی موجودگی میں موضوع یا پھر قصے کی اہمیت ثانوی ہوکر رہ جاتی ہے۔ یہ سوالات کہ قصہ مصنف کا طبع زاد ہے کہ نہیں یا اس نے قدیم قصوں سے مواد لے کر حسب ضرورت کمی بیشی کر کے اسے نظم کیا ہے یا کہ قصہ دیو مالائی نوعیت کا ہے اور یہ کہ اس میں جنوں اور پریوں کی باتیں ہوں اس لیے یہ جدید حقیقت نگاری کے معیاروں پر پورا نہیں اترتا اور جدید ذہن کے لیے قابل قبول نہیں ہے، شعر و ادب کی اہمیت اور اس کے اسلوب بیان شعریت اور تخلیقی وفنی جوہر اور انداز و اسلوب بیان پر منحصر ہوتا ہے۔ ہومر، فردوسی، سعدی، حافظ، دانتے، تلسی داس، جائسی، شیکسپیئر، ملٹن، سودا میر، غالب جیسے عظیم ترین شاعروں اور ادیبوں نے ایسی کوئی بھی بات نہیں کی ہے جو کہ کسی نہ کسی طرح سے پہلے کہی جا چکی ہو، بلکہ ان کے اسلوب تخلیقی اور فنی جوہر اور شعریت اور ادبیت نے پرانی باتوں اور مسلمات میں نئی باتیں پیدا کی ہیں۔

جہاں تک قصے کے دیو مالائی نوعیت، فوق الفطری حالات و واقعات، جنوں اور پریوں کے کرداروں کا تعلق ہے یہ

حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ صدیوں تک یہی صورت حال مشرق ومغرب میں یکساں طور پر کارفرما رہی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ جیسے جیسے تہذیب وتمدن، سائنسی علوم وایجادات نے ترقی کی ہے ویسے ویسے جدید دور میں داستانی ادب اورفوق الفطری عناصر کے لئے گنجایش کم سے کم تر ہوتی چلی گئی۔ بہر حال قدیم دور کا انسانی ذہن داستان، دیومالا، اور دیگر فوق فطری عناصر اور توہمات کا کتنا ہی معتقد رہا ہو۔ اس دور کی ادبی تخلیقات کو آنکھیں بند کر کے نہ تو یکسر رد کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی انھیں طاق نسیاں کا گلدستہ بنایا جا سکتا ہے۔ ان قصوں اور کہانیوں کے دیو، جن، پری اور دیگر فوق الفطری عناصر کے توسط سے انسانی نفسیات اور فطرت کے شعوری اور تحت الشعوری اور غیر شعوری افعال واعمال کو پیش نظر کیا گیا ہے اور انھیں کے سہارے تہذیب وتمدن، سائینسی علوم، ایجادات نے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔ انسانی نفسیات کے غائر مطالعے اور تجزیے کے بغیر ایسے اشعار کہے ہی نہیں جا سکتے۔ یہ اشعار بظاہر دیو، پری، یا راجہ اندر کے منھ سے ادا کئے گئے ہوں لیکن یہ گوشت پوشت کے انسانوں کے حقیقی جذبات کو پیش کرتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ایسے جذبات فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں۔

گلزار نسیم کے اہم ترین کردار تاج الملوک اور بکاؤلی ہیں جو اس قصے کے ہیرو اور ہروئین ہیں، دونوں کے کرداروں میں زندگی اپنی تمام کیفیتوں، کمیتوں، اور قوتوں کے ساتھ بھرپور انداز میں پائی جاتی ہے۔، دونوں ذہین ہیں، فعال ہیں اور مسائل و مصائب سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ وہ ہر مشکل اور پریشانی کی سامنا بڑی ہی خندہ پیشانی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اپنی ہمت اور صلاحیت اور ذہانت وہوشیاری سے اپنی مشکلات کا حل ڈھونڈتے ہیں۔ ایسی کوئی بھی صورت حال سامنے نہیں آتی کہ وہ مشکل یا پھر کسی مشکل سے گھبرا کر مجہول اور بے دست و پا ہو کر انفعالیت کا شکار ہو کر رہ گئے ہوں۔ تاج الملوک نے دلبر بیسوا کے فریب سے پردہ چاک کیا، اس کو شکست دی، دیو کو حلوہ کھلا کر رام کیا، گل بکاؤلی کو حاصل کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بکاؤلی پر فریفتہ ہو گیا۔ لیکن اس وقت اس کو بیدار کرنا مناسب نہ سمجھا، بیدار کرتا تو وہ پھول گنوا بیٹھتا اور نہ معلوم وہ کن کن مصائب اور مشکلات سے دوچار ہو جاتا، اس وقت اس نے صبر سے کام لیا اور انگوٹھی بدلنے پر ہی اکتفا کیا، صحرائے طلسم میں گرفتار ہو کر بھی اس نے اپنے حواس کو بیدار رکھا، پرندوں کی گفتگو سے اس نے ہدایات رہ نمائی حاصل کی ان پر عمل کیا اور صحرائے طلسم سے وہ بآسانی نکل آیا۔ اس نے پھول کو حاصل کرنے کے لیے کیسی کیسی تکلیف اٹھائیں اور زحمتیں برداشت کیں۔ چاروں شہزادوں نے اس سے پھول چھین لیا تو اس نے ارم جیسی بستی بسالی؛ بادشاہ سے برابری؛ سے ملا، پھول کے حاصل کرنے کے واقعات کو بیان کیا اور شہزادوں کی چوٹ اور ان کی سینہ زوری کا راز فاش کیا۔ بکاؤلی کے اندر سبھا میں جانے کے بارے میں بکاؤلی سے پوچھنے کے بجائے اس نے خود ہی پتا لگایا، اندر سبھا میں جانا اخطرے سے خالی نہ تھا لیکن وہ خطرات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

اسی طرح سے بکاؤلی بیدار ہوتی ہے تو پھول کو غائب پاتی ہے، وہ ایک عورت کی طرح سے جھنجھلاتی ہے، روتی ہے، غصہ کرتی ہے، لیکن وہ پھر پورے اعتماد کے ساتھ ہمت باندھ کر پھول کی تلاش میں نکل پڑتی ہے، گلچیں یعنی تاج الملوک کا پتا لگا لیتی ہے۔ چاہتی تو وہاں پر اپنا راز بیان کر دیتی لیکن وہ وہاں پر خاموش رہتی ہے کیونکہ وہ اپنا راز تاج الملوک کو بتا دیتی تو اس کو ڈانٹتے اور کھال کھنچوانے کی دھمکی دینے کا موقع نہ ملتا، مزید یہ کہ وہ اس پر فریفتہ ہو گئی تھی اس لیے اس نے اپنے گھر پہنچنے کے بعد اس کو اپنے یہاں پر بلایا اور اس کو ڈانٹا۔ بقول ڈاکٹر گیان چند:

''اس مثنوی میں کردار نگاری مکمل ہے کم قصوں میں ایسے ہیرو اور ہیروئین ملیں گے جن میں زندگی اس

قدر جوش کھا رہی ہو؛''

یہاں پر یہ بھی دھیان رہنا چاہیے کہ اس کے کردار اس لیے فعال ہیں کہ جس دور میں یہ مثنوی لکھی گئی تھی اس وقت جاگیردارانہ نظام زندگی اپنے دن پورے کر چکا تھا اور نئے دور یعنی سرمایہ دارانہ دور کی آمد آمد تھی اور سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی بنیاد فعالیت پر تھی اور اس میں ہر فرد کو جدوجہد کرنی ہوتی ہے۔ مزید بریں جنوب مشرقی ہندوستان پر انگریز قابض ہو چکے تھے۔ دخانی کشتیوں اور ریلوں، تار برقی وغیرہ ترقی کی صورت میں سائنسی ایجادات کے کرشموں کی جھلک دکھائی دینے لگی تھی۔ اودھ میں اور بالخصوص لکھنو میں انگریزوں کا عمل دخل کافی بڑھ چکا تھا، اور نئی روشنی پھلنے لگی تھی اس کے ساتھ ہی عام زندگی میں بھی فعالیت پیدا ہونے لگی تھی، اگر گلزار نسیم بھی پچاس ساٹھ برس قبل لکھی گئی ہوتی تو اس کے کردار بھی سابق داستانوں اور مثنویوں کی طرح سے مجہول اور بے عمل ہوتے۔

گلزار نسیم کی ایک بڑی خوبی اور اس کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ پوری مثنوی غزل کی زبان میں ہے اور غزل کی زبان کی خصوصیات میں ایجاز، اختصار، اور اشعاریت یعنی ایمائیت اور اشاریت کو اہمیت حاصل ہے اور گلزار نسیم کے ہر شعر میں یہ خوبی موجود ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے اس کا ہر شعر غزل کے شعر کی طرح سے استعارے کے پیرائے میں کہا گیا ہے۔ اور غزل کے ہر شعر کی طرح سے مکمل ہے، اس میں استعاراتی کیفیت اور معنویت کی وسعت پائی جاتی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ مثنوی میں کون سی بحر استعمال کی جاتی ہے؟
۲۔ مثنوی کے اجزائے ترکیبی کتنے ہیں؟
۳۔ گلزار نسیم کے علاوہ دکن کی مشہور مثنویوں کے نام بتائیے۔
۴۔ شمالی ہند کی سب سے اہم مثنوی کون سی ہے؟
۵۔ مثنوی کے موضوعات بیان کیجیے۔
۶۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کی شاعری کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

3.6 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے مثنوی گلزار نسیم کے مطالعہ کیا ہے۔ گلزار نسیم کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ہم مثنوی اور اس کی تعریف اجزائے ترکیبی کا مطالعہ بھی کریں۔ مثنوی کی تاریخ، آغاز و ارتقا کو بھی جاننے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ یہ سمجھ سکیں کہ گلزار نسیم کس پس منظر میں لکھی گئی تھی۔ اس کے بعد مثنوی کے موضوعات اور خصوصیات کے بارے میں معلومات حاصل کی گئی ہیں، مثنوی گلزار نسیم کے اصول کے بارے میں جاننے کی کوشش کی گئی ہے، جس کی روشنی میں پنڈت دیا شنکر نسیم کی زبان و بیان کو سمجھا جا سکے۔ آخر میں گلزار نسیم کا متن بھی پیش کیا گیا ہے جس سے دیا شنکر نسیم کی شاعری سے لطف اندوز ہو سکیں اور ان کی شاعری کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

3.7 نمونہ برائے امتحانی سوالات

۱۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کی زبان و بیان کی خوبیوں کو واضح کیجیے۔
۲۔ گلزار نسیم کے متن میں دیے گئے واقعات کو اپنی زبان میں لکھیے۔

3.8 فرہنگ

فصد لینا	اپنے جنون کا علان کرنا	عقدہ کھلا	بھید کھلا
کڑی اٹھانا	مصیبت اٹھانا	خام پارہ	مکار عورت
افتاد پڑنا	مصیبت پڑنا حادثہ پیش آنا	اندام	جسم
ساعد	بازو، کلائی	تازیانہ	کوڑا
مژگان	پلکیں	راست موبر اندام	رونگٹے کھڑے ہو گئے
قند گھولنا	شیریں سخن ہونا	ہیہات	افسوس

3.9 معاون کتب

۱۔ مثنوی گلزار نسیم — مرتب رشید حسن خاں
۲۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ — سید احتشام حسین
۳۔ ہندوستانی قصوں سے مأخوذ اردو مثنویاں — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
۴۔ تاریخ مثنویات اردو — جلال الدین احمد

اکائی 4 اردو مرثیہ: تعارف اور صنفی خصوصیات

اکائی کے اہم اجزا

4.1 اغراض ومقاصد

4.2 تمہید

4.3 مرثیہ کی تعریف اور فن

4.4 مرثیہ کی اقسام

4.5 مرثیہ کے اجزائے ترکیبی

4.6 اردو مرثیہ کا ارتقا

4.7 نمونہ برائے امتحانی سوالات

4.8 فرہنگ

4.9 معاون کتب

4.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ:

- ☆ مرثیہ کی تعریف کو سمجھا سکیں۔
- ☆ مرثیہ کے سماجی اور مذہبی پس منظر کو تاریخ کے تناظر میں سمجھا پائیں گے۔
- ☆ مرثیہ کے اجزا کی وضاحت کر سکیں۔
- ☆ مرثیہ کی تاریخ کا جائزہ لے سکیں۔

4.2 تمہید

مرثیہ عربی زبان سے فارسی میں داخل ہوا ہے اور دیگر اصناف کی طرح سے اردو میں فارسی زبان سے اخذ کیا گیا ہے۔ اردو مرثیہ عربی شاعری کے مقابلے میں فارسی شاعری سے زیادہ متاثر ہوا، اردو میں کربلائی اور شخصی مرثیے لکھے گئے۔ اس میں ابتداء میں لوازمات شعری کا اہتمام نہیں کیا جاتا تھا، لیکن بعد میں لوازمات شعری اور فن پر بہت توجہ دی گئی۔ مرثیہ شاعری میں کمال کی انتہا کو پہنچا اور ؛ بگڑا شاعر مرثیہ گو ؛ کا مقولہ غلط قرار پایا۔ ضمیر، انیس، دبیر، جوش وغیرہ نے مرثیہ کے فن کو عروج بخشا اور اس کے اندر فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے۔

4.3 مرثیہ کی تعریف اور فن

مرثیہ کو عربی زبان میں؛ رثاء؛ کہا جاتا ہے اور لغت میں اس کے معنی ہیں رونا، ماتم کرنا، یا مرنے والے کی خوبیاں بیان کرنا یعنی مرنے والے کے اوصاف بیان کر کے اظہارِ رنج وغم کیا جائے۔

مطلب یہ ہے کہ مرثیہ کسی کی موت پر لکھا جاتا ہے اور مرنے والے کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ مرثیہ میں مرنے والے کے اوصاف کے ساتھ ساتھ اس کے اندر بہت سے اضافی موضوعات بھی شامل ہو گئے۔

عربی تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ عرب میں مرثیہ کو بڑی مقبولیت حاصل تھی اور یہ عربی شاعری کی قدیم ترین صنف میں شمار کیا جاتا ہے۔ عربی شعراء کسی بھی اہم شخصیت کے مرنے پر اپنے پر اثر پیرائیہ بیان میں اپنے جذبات کا اظہار کیا کرتے تھے۔

مرثیہ ایک موضوعاتی صنف ہے نہ کہ ہیئتی کیونکہ مرثیے مختلف ہیئتوں میں لکھے گئے ہیں غزل کی ہیئت میں بھی اور مسدس کی ہیئت میں بھی۔ دراصل مرثیہ کی پہچان اس کے موضوع سے ہوتی ہے یعنی کسی کی موت پر اظہار رنج وغم کرنا۔

مرثیہ کا سماجی اور مذہبی پس منظر: مرثیہ کا نام آتے ہی ہمارا دھیان واقعات کربلا کی طرف چلا جاتا ہے۔ اور کربلا کے مرثیہ کو ہی اصل مرثیہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ مرثیہ عربی شاعری کی اہم صنف ہے اور عرب میں شخصی مرثیہ نگاری کو رواج دیا ہے اپنے کسی عزیز کے مرنے پر اپنے جذبات کا اظہار مرنے والے کی خوبیوں کے بیان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

واقعہ کربلا کے بعد مرثیہ میں حضرت امام حسینؓ اور ان کے اعزہ کی شہادت کا بیان شدت سے کیا جانے لگا اس کے بعد جب عربی شاعری ایران پہنچی تو عجمی اثرات کی باعث رثائی شاعری میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔

اردو شاعری پر ایرانی اثرات کے باعث اردو میں ابتداء ہی سے مرثیہ نگاری کا رواج رہا ہے اور دکنی شاعری میں اس کے ابتدائی نمونے بکثرت موجود ہیں۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کے حکمراں شیعہ عقائد کے حامل تھے تعزیہ داری کے ساتھ وہ عاشور خانوں میں خصوصی مجالس کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ وجہیؔ، غواصیؔ، شاہیؔ، اور ہاشمیؔ نے حضرت امام حسین اور آپ کے اعزہ کی شان میں مرثیہ لکھے۔ ان مرثیوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

4.4 مرثیے کی اقسام

مرثیہ کے موضوعات؛ اردو شاعری میں مرثیہ کے موضوعات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ کربلائی مرثیہ ۲۔ شخصی مرثیہ

کربلائی مرثیہ: کربلا کے واقعات میں شہادت امام حسینؓ ایک سانحہ ہے جو کہ تاریخ اسلام ہی میں نہیں بلکہ تاریخ ادب میں بھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ ان واقعات کو شاعروں نے مرثیوں کا موضوع بنایا ہے، یہ شخصی مرثیہ کی طرح سے نہیں ہوتے ہیں ان کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ ان میں حضرت امام حسینؓ اور ان کے اعزہ کی شہادت اور دیگر واقعات کو مرثیہ کا موضوع بنایا گیا ہے۔

شخصی مرثیہ: اس میں عزیزوں اور قوم کے مقتدر لوگوں کی موت پر اظہار رنج وغم کیا جاتا ہے، جیسے غالبؔ کی وفات پر حالیؔ کر مرثیہ یا عارف کی وفات پر غالبؔ کا مرثیہ۔ اس کے علاوہ کچھ سیاسی لوگوں کے بھی مرثیہ لکھے گئے، جیسے گوکھلے اور تلک کا مرثیہ پنڈت برج نارائن چکبستؔ نے لکھا ان میں انھوں نے مرثیہ کے اجزاء کا اہتمام نہیں کیا بلکہ قومی اشخاص کے مرثیے جذباتی انداز میں پیش کئے جن کے اندر صرف شخصیت کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

4.5 مرثیے کے اجزائے ترکیبی

ابتدا میں مرثیہ کی کوئی ہیئت یا فارم متعین نہ تھی، شروع میں مرثیہ غزل کی ہیئت میں پھر چار مصرعوں کی شکل میں اور پھر اس کے بعد میں مسدس کی شکل میں لکھے جانے لگے۔

مرثیے کے اجزائے ترکیبی

۱۔ چہرہ: یہ مرثیہ کا تمہیدی حصہ ہوتا ہے مرثیہ میں تمہید کے طور پر منظر نگاری کی جاتی ہے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قاری کو اس ماحول سے متعارف کرادیا جائے جس ماحول میں واقعہ ہوا ہے، قارئین یا سامعین کے ذوق کے مطابق ہی تمہید یعنی چہرہ نظم کیا جاتا ہے تاکہ سامعین اپنے آپ کو اس ماحول میں محسوس کرسکیں، اس تمہید کا مرثیہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے، جیسے کہ انیس نے ؛نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری؛ میں جو چہرہ نظم کیا ہے اس میں انھوں نے اپنی اور اپنے آباء واجداد کی شاعرانہ خوبیوں کو بیان کیا ہے، اسی طرح سے صبح کی دلکشی، دوپہر کی گرمی، اور رات کی تاریکی، سفر کی صعوبتیں اور دنیا کی ناپائداری کو بھی چہرہ کا موضوع بنایا گیا ہے۔

۲۔ سراپا: اس حصے میں ہیرو کے سراپا کا ذکر کیا جاتا ہے، ہیرو کی قد قامت، اس کی شان وشوکت اس کے لباس کا ذکر بڑے پراثر انداز میں کیا جاتا ہے۔

۳۔ رخصت: یہ مرثیہ کا ایسا جز ہے جو کہ جس کے اندر ہیرو اپنے عزیز اور رشتے داروں سے رخصت ہوکر میدان جنگ میں آتا ہے، کیوں کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہورہا ہے اور اس جنگ میں وہ شہید ہونے جارہا ہے اور اسے اپنوں سے بچھڑنے اور اپنوں سے رخصت ہونے کا احساس دل کو کس طرح سے تڑپاتا ہے۔ رخصت میں ہی کیفیات بیان کی جاتی ہے اور اس کو رقت آمیز انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔

۴۔ آمد: جب مرثیے کا ہیرو میدان جنگ میں جاتا ہے تو اس منظر کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس، ہیرو کا لباس اس کے ہتھیار، گھوڑے کی خوبیوں، ہیرو کی بہادری، اور جنگی مہارت کا بیان پوری جزئیات کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

۵۔ رجز: جب جنگ میں کوئی بہادر مقابلے کے لیے آتا ہے تو وہ دشمن فوجوں کو للکارتا ہے، اور اپنے خاندان کہ بہادری اور شجاعت کا بیان کرتا ہے، وہ اپنی طاقت، بہادری، اور جنگی کارناموں کا بیان بڑے فخریہ انداز سے کرتا ہے۔ اس کو رجز کہا جاتا ہے۔

۶۔ جنگ: جنگ میں حرب وضرب کا بیان کیا جاتا ہے، جب جنگ ہوتی ہے تو مقابل ایک ہو یا پھر پوری فوج ان سے جنگ کرنا،

اس میں جو بھی ہتھیار استعمال کیے جاتے ہیں۔ وار کرنا، بچنا، گھوڑے کی رفتار، اس کا غصہ، تلوار کی تیزی، اور اس کی تعریف کے ساتھ جنگی مہارت وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔

۷۔شہادت: ہیرو جنگ میں بہادری سے مقابلہ کرتا ہے تو دشمن اس کو اپنے نرغے میں لے لیتے ہیں، ہیرو ان سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو جاتا ہے، اس شہادت کا بیان، زخموں کا ذکر، پورے جذبات اور جوش وخروش کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

۸۔ بین: اس کو مرثیے کا آخری جز کہا جاتا ہے اس میں ہیرو کی شہادت کا پتا لگنے پر اس کے اعزہ گریہ وآزاری کر کے اپنے جذبات کو پر درد انداز میں رو رو کر بیان کرتے ہیں۔

چوں کہ مرثیہ کا یہی مقصد ہوتا ہے یعنی کسی کی موت پر اظہار غم وافسوس کرنا، مرثیہ میں جنگ، شہادت اور بین کو کافی اہمیت حاصل رہی ہے، ان چیزوں کا التزام شعرا حضرات کرتے رہے ہیں۔ جب کہ دوسرے اجزاء کا استعمال شعراء اپنی مرضی ار موقع کے لحاظ سے کرتے ہیں۔

مرثیہ میں واقعات کربلا؛ واقعہ کربلا مرثیوں کا اہم حصہ رہا ہے سنہ ۶۰ ہجری میں حضرت امام حسین کو کربلا میں بلا کر علقمہ نہر کے کنارے پر ماہ محرم کی ۷ تاریخ سے ان کے ۷۲ ساتھیوں کے ساتھ پانی بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت امیر معاویہؓ سے قبل اسلام میں خلافت جمہوری اصول پر تھی، لیکن معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی نیابت رسول کا اعلان کر دیا اور پھر بعد میں یزید نے امام حسینؓ کو دھوکے سے کربلا میں بلوایا اور وہاں پر اپنی بیعت کرانی چاہی لیکن آپ نے اسلامی اصول کے خلاف بیعت کرنے سے انکار کر دیا اور حق کے لئے جان دینا قبول کر لیا جس کے نتیجے میں آپ کو اور آپ کے ۷۲ ساتھیوں کو شہید کر دیا گیا۔ یہ حق اور باطل کی کشمکش اور جنگ تھی۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے　　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ان میں حضرت عباس، حضرت قاسم، حضرت اکبر، حضرت اصغر، امام حسین، عون محمد، حضرت حر، وغیرہ شہید ہوئے اور مرثیہ کو اعزہ داری کا ذریعہ قرار دیا گیا، آج بھی مرثیے اسی لیے لکھے جاتے ہیں۔

4.6 اردو مرثیہ کا ارتقا

اردو شاعری فارسی اثرات کے تحت پروان چڑھی اور فارسی میں عربی کے زیر اثر مرثیہ بھی شامل ہوا، فارسی واقعات میں کربلا کو اہمیت دی گئی، اردو میں بھی فارسی کے زیر اثر مرثیہ کا مطلب واقعات کربلا ہی کا بیان رواج پانے لگا۔ دکنی شاعری میں اس کے نمونے بکثرت ملتے ہیں، گولکنڈہ اور بیجاپور کے فرمانروا ماہ محرم میں اعزہ داری کی تمام رسومات پابندی کے ساتھ ادا کرتے تھے اور ان کا خصوصی اہتمام کیا کرتے تھے، امام باڑے عاشور خانے وغیرہ تعمیر کی گئی، دکنی شعراء جیسے وجہی، غواصی، شاہی، افضل ہاشمی، اور مرزا بیجاپوری نے حضرت امام حسین اور تمام شہدائے کربلا کو مرثیہ کے ذریعہ سے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے ان مرثیوں کی بڑی اہمیت ہے لیکن روایتی اجزاء اور حسن شاعری کی کمی محسوس ہوتی ہے، زبان دکنی ہے، ان مراثی میں جذبات نگاری کے بے شمار نمونے نظر آتے ہیں۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتداء ولی دکنی کی آمد کے بعد سے شروع ہوتی ہے، یہاں پر غزل اور دیگر اصناف سخن کے

ساتھ ساتھ مرثیے بھی لکھے گئے ان میں مذہبی عقیدت جھلکتی ہے اور محاسن فن کا بھی اہتمام نظر آتا ہے لیکن میر اور سودا کے دور میں اس پر باقاعدہ توجہ دی گئی، سودا نے اردو اور پنجابی میں مرثیے لکھے مندرذیل مصرعوں میں انھوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے

کھانا ترک کیے پر اس کو غم ایسے کیا کھانا پڑے　　بیٹے بھتیجے بھانجے سب کے سر ناچار کٹانا پڑے
ہائے رے ایسی عزت پر اس کو کیا کیا ظلم اٹھانے پڑے　　جان کھپی، ناموس گئی، گھر بار گیا، رسوائی ہوئی

میر نے بھی مرثیے لکھے لیکن انھوں نے زیادہ توجہ صرف نہیں کی، ان کے ہم عصر سودا نے جو مرثیے لکھے اس میں انھوں نے واقعات کربلا کو ترتیب سے پیش کیا ہے اور کردار نگاری، واقعات نگاری، جذبات نگاری کے لحاظ سے ان مرثیوں کی بڑی اہمیت ہے۔

دبستان دہلی میں مرثیے کم لکھے گئے، غالب نے ایک مرثیہ غزل کے فارم میں لکھا ہے اور یہ مرثیہ زین العابدین عارف کی وفات پر انتہائی غم کے اظہار کے لیے لکھا ہے، اس میں انھوں نے جذبات نگاری کا بڑا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے　　کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

مرثیے کے فن کو صحیح معنوں میں لکھنو میں ترقی ملی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ لکھنو کے نواب شیعہ مسلک کو ماننے والے تھے، اس کے علاوہ وہ شعراء کو مالی اعتبار سے بھی نوازتے تھے تیسرے یہ کہ وہاں کی عوام بھی ان کو داد تحسین دیا کرتی تھی اور پھر یہاں پر؛ بگڑا شاعر مرثیہ؛ کا مقولہ الٹا ثابت ہو گیا اور جو الزامات لکھنو کی شاعری پر لگائے جاتے تھے جیسے ابتذال، معاملہ بندی عریانی، فحاشی وغیرہ تو کچھ شعراء نے اپنے حسن عمل اور شاعرانہ فن کاریوں سے اس کا کفارہ ادا کر دیا ان میں انیس، دبیر، امیر و محسن عزیز وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، ان میں انیس نے تو اپنے فن میں اپنے بعد کسی کو بھی نہ ٹکنے دیا، لکھنو میں خلیق، ضمیر، دلگیر اور فصیح نے مرثیہ گوئی میں بہترین شاعری کے نمونے پیش کئے ہیں۔

ضمیر نے مصحفی سے اصلاح سخن لی اور فنی اعتبار سے صنف مرثیہ میں بعض بہت اہم اضافے کئے اور حالات و واقعات کو مختلف عنوانات کے تحت لکھنا شروع کیا اور مرثیہ کو شاعرانہ محاسن سے بھی آراستہ کیا، اس میں انھوں نے نئے نئے موضوعات کو داخل کیا اور موضوعات کی تقسیم بھی کی۔ ضمیر نے مرثیہ کو مسدس کی ہیئت میں لکھنا شروع کیا اور اس کے علاوہ انھوں نے منظر نگاری، تلوار کی تعریف اور گھوڑے کی تعریف میں مبالغہ سے بھی کام لیا ہے۔

گھوڑا تھا چھلا وہ کبھی یاں کبھی واں　　آتا کبھی نظر اور کبھی نظروں سے نہاں تھا
جوں برق قیام ایک جگہ اس کو کہاں تھا　　گہہ میمنہ[1] گہہ میسرہ[2] کی سمت رواں تھا

بے حکم تو قاسم کے نہ ٹھہرا وہ کہیں پر
رفتار میں رہ رہ گیا سایہ بھی زمیں پر

(۱،۲ میدان جنگ میں فوج کی دائیں ٹکڑی کو میمنہ اور بائیں ٹکڑی کو میسرہ کہا جاتا ہے۔)

خلیق میر حسن کے بیٹے اور انیس کے والد تھے، یہ بھی مصحفی کے شاگرد تھے ان کا کلام اتنا بلند پایا ہے کہ انیس اور ان کے کلام میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے، ان کا نمونہ کلام مندرجہ ذیل ہے۔

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیاں وہ سحر　　دم بدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
اوس نے فرش زمرد پہ بچھائے تھے گہر　　لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر

دشت سے جھوم کے جب بادصبا آتی ہے
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی ہے

انیس اور دبیر نے مرثیے کے فن کو بام عروج پر پہنچایا، خود مرزا غالب نے کہا ہے کہ مرثیہ میں انیس و دبیر کا جواب نہیں اور ان کے مرتبے تک پہنچنا ناممکن ہے۔

مرثیہ نگاری نے رزمیہ شاعری کی کمی کو پورا کیا ہے۔ انیس نے مضامین کے دریا بہادیئے اور شاعری میں منظر نگاری، کردار نگاری، واقعہ نگاری کے ساتھ جذبات نگاری کے باکمال نمونے پیش کیے ہیں۔

مرزا دبیر علم و فضل میں بہت آگے تھے۔ ان کی شاعری میں عالمانہ وقار اور پرشکوہ انداز نگارش ان کی علمیت کی نشانی ہے، مرثیہ لکھنے کا سلسلہ انیس کے خاندان میں جاری رہا لیکن جوش ملیح آبادی نے اردو مرثیہ کے معیار اور مزاج کو بدل دیا

4.7 نمونہ برائے امتحانی سوالات

۱۔ مرثیہ کی تعریف اور اس کی تاریخ بیان کیجیے۔
۲۔ مرثیہ کے اقسام تحریر کیجیے۔
۳۔ مرثیہ کے اجزائے ترکیبی بیان کیجیے۔
۴۔ مرثیہ کے ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

4.8 فرہنگ

فرش	زمین	دشت	جنگل
غنچوں	کلیوں	شجر	درخت
معیار	پیمانہ، کسوٹی	برق	بجلی
مرگ	موت	ترک کرنا	چھوڑ دینا
سمت	طرف	مہارت	ہنرمندی
شہید	خدا کی راہ میں مارا جانے والا، ناحق مارا جانے والا شخص	آراستہ	سجانا، سنوارنا

4.9 معاون کتب

۱۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری — ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
۲۔ موازنۂ انیس و دبیر — علامہ شبلی نعمانی

اکائی 5 مرثیہ کے منتخب بند (میر انیس)

اکائی کے اہم اجزا

5.1 اغرض ومقاصد

5.2 تمہید

5.3 میر انیس کے حالات زندگی

5.4 میر انیس کے کلام کی خصوصیات

5.5 مرثیہ کے منتخب بند اور ان کی تشریح

5.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

5.7 فرہنگ

5.8 معاون کتب

5.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں میر انیس کے حالات زندگی اور ان کے کلام کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے مرثیوں کے چند منتخب بند دیے گئے ہیں اور ان کی تشریح بھی کی گئی ہے۔

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ:

- ☆ انیس کے متعلق کوائف کو بیان کر سکیں۔
- ☆ انیس کے مرثیہ نگاری کی خصوصیات کو سمجھا سکیں۔
- ☆ مرثیہ کے اشعار کی تفہیم کر سکیں۔

5.2 تمہید

انیس نے اردو مرثیہ کی شان بڑھائی ہے، ان کا مشاہدہ زبان و بیان، اور جذبات و احساسات کا میلان ان کے مرثیو ں کو وقار عطا کرتا ہے۔ میر انیس اردو مرثیہ کے آفتاب و ماہ تاب ہیں۔ انھوں نے اردو مرثیہ کو ایسا وقار عطا کیا ہے کہ اردو شاعری دنیا کی کسی بھی شاعری کا مقابلہ کر سکتی ہے، انیس نے اردو شاعری میں رزمیہ شاعری کی کمی کو پورا کیا ہے۔ انیس نے مرثیہ نگاری کی پرانی روایت کو ترک کر کے مرثیہ کے صنف کو نئی سمت عطا کی ہے۔

5.3 میر انیس کے حالات زندگی

میر ببر علی نام انیسؔ تخلص یو پی کے شہر فیض آباد کے محلّہ گلاب باڑی میں ۱۸۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ابتداء میں انھوں نے اپنا تخلص حزیں رکھا تھا،مگر اردو کے مایہ ناز شاعر امام بخش ناسخ کے مشورے پر انھوں نے اپنا قلمی نام بدل کر انیس رکھا۔ان کے اسلاف مغل بادشاہ شاہ جہاں کے عہد حکومت میں ہرات سے دہلی آئے تھے ان کے خاندان میں شعروشاعری کی روایت بہت پرانی ہے اور ان کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ان کی آباء اجداد میں میر غلام حسین ضاحک سودا کے ہم عصر تھے جو کہ اردو کی تاریخ میں ہجویات اور طنزیات کے لئے مشہور ہیں لیکن انھوں نے بہت سے مراثی بھی لکھے ہیں۔دہلی میں جب سیاسی اتھل پتھل ہوئی تو وہاں کے حالات سے پریشان ہوکر میر ضاحک بھی دوسرے شعراے،اور ادباء کے ساتھ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دہلی سے فیض آباد پہنچے۔اس وقت ان کے بیٹے میر حسن کی عمر صرف بارہ سال کی تھی۔میر حسن میر انیس کے دادا تھے اور ان کے منجھلے لڑکے میر مستحسن خلیق میر انیس کے والد تھے۔اس گفتگو سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ میر انیس کے گھر میں شاعری اور خصوصاً مرثیہ گوئی کی ایک طویل روایت موجود تھی جس کے اثرات انیس کی مرثیہ گوئی پر بھی پڑے اور انیس کو اپنی اس خاندانی روایت پر بھی بڑا فخر تھا:

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
ساتویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

شاعری کی ابتدا

میر انیس نے اپنے خاندان کی اس شاعری کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی شاعری کی ابتداء بھی غزل سے کی تھی، مگر انھوں نے اپنے والد میر خلیق کے مشورے سے مرثیہ گوئی کے میدان میں قدم رکھے، وہ اپنے گھر کے شاعرانہ ماحول سے بہت متأثر تھے اور بہت کم عمری میں انہیں اردو اور فارسی کے ہزاروں اشعار یاد ہو گئے تھے۔ایک مرتبہ انھوں نے نواب سید محمد خان رندؔ جوان کے والد کے شاگرد تھے کے اصرار پر ایک مشاعرہ میں شرکت کی۔اس مشاعرہ میں انیس کو کافی شہرت ملی یہ خبر جب ان کے والد کو ہوئی تو انھوں نے انیس کو اپنے پاس بلوایا اور ان سے وہ غزل سنی جو کہ انھوں نے اس مشاعرے میں پڑھی تھی،انھوں نے اس غزل کی تعریف کی اور ان کو یہ مشورہ بھی دیا کہ اب اس غزل کو سلام کرو مطلب یہ تھا کہ اس غزل کو سلام میں تبدیل کرو۔میر خلیق اپنے بیٹے کی افتادِ طبع سے واقف تھے اس لیے انھوں نے انیس کو مرثیہ کی طرف توجہ دینے کا مشورہ دیا اور انیس نے اس کو قبول کیا اور پھر انھوں نے مرثیہ گوئی میں ایک مقام حاصل کیا۔

5.4 میر انیس کے کلام کی خصوصیات

مرثیہ اردو شاعری کی ایک اہم ترین صنف ہے۔میر انیس اور مرزا سلامت علی دبیر نے اس صنف کو بام عروج پر پہنچا دیا ہے۔ان دونوں شاعروں میں میر انیس زیادہ اہم اور فطری ہیں،اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اسلوب سادہ رواں اور آسان ہے۔میر انیس کا خاندان ایک زمانے سے خالص اردو لکھنے اور بولنے کے لئے مشہور تھا،میر انیس کو بیانیہ پر بری حیرت انگیز قدرت

حاصل تھی جس کا مظاہرہ انھوں نے انسانی جذبات کی عکاسی، جیسے رنج وغم، درد وخوف، مسرت اور حیرت وغیرہ نیز بہادری، مناظر قدرت اور جنگ کے بیان میں بڑی فنی مہارت اور چابک دستی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انیسؔ کو حالیؔ نے اپنے طرز کا خاتم قرار دیا ہے۔

''یہ امید نہیں کہ اس طرز میں اب کوئی شخص ان کا سا کمال حاصل کرے گا۔'' (مولانا حالیؔ)

انیس کو اپنے گھر کی زبان پر بڑا فخر تھا وہ اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ؛ یہ میرے گھر کی زبان ہے؛ یعنی زبان کی صفائی اور طرز ادا پر انیس کی خاص توجہ تھی۔ آب حیات میں محمد حسین آزاد ان کی اس صفت کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ

''صفائی کلام، لطف زبان، چاشنی محاورہ، خوبی بندش، حسن اسلوب، طرز ادا اور سلسلے کی ترتیب میں ان کا کوئی جواب نہیں۔''

اردو مرثیہ کے سلسلے میں سودا نے دو اہم کام کئے ہیں اول تو انھوں نے اس صنف کے لیے ہیئت کا تعین مسدس کی شکل میں کیا اور دوسرے یہ اس صنف کو گریہ وآہ وزاری کے علاوہ شاعری کے نئے امکانات تلاش کرنے پر زور دیا۔ انیس نے سودا کی اس روایت کو مرتبہ کمال تک پہنچایا۔

فصاحت

کلام انیس کو اس کی فصاحت اور بلاغت کی وجہ سے ممتاز قرار دیا گیا ہے، خود انیس بھی اپنے کلام کی فصاحت اور بلاغت پر فخر کرتے ہیں، فصاحت کے معنی ایسے شیریں الفاظ کا استعمال کرنا جو کہ کانوں کو بھلے معلوم ہوں، انیس نے حتیٰ الامکان بھدے اور ناگوار الفاظ کے استعمال سے پرہیز کیا ہے۔ علامہ شبلی نے ان کے کلام کی فصاحت کو ظاہر کرنے کے لیے انیس اور دبیر کے ہم مضمون اشعار یکجا کیے ہیں۔

دبیر	انیس
کس نے انگوٹھی دی رکوع و سجود میں	سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں
آنکھوں میں پھرے ہے اور نہ دم کو خبر ہو	آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو
رُویا میں بھی حسین کو رویا کرتے ہیں	حسرت ہے کہ خواب میں بھی رویا کیجئے
جیسے مکاں سے زلزلہ میں صاحب مکاں	جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کر بھاگے

انیس کا کمال یہ ہے کہ وہ شاعری میں زیادہ سے زیادہ الفاظ استعمال کرتے ہیں اور بہت سے چھوٹے بڑے واقعات کو بھی نظم کیا ہے مگر علامہ شبلی کے مطابق ان کے یہاں پر غیر فصیح الفاظ بہت کم پائے جاتے ہیں۔

بلاغت

کلام انیس کا دوسرا بڑا وصف اس کی بلاغت ہے، بلاغت کے معنی ہیں کہ کلام میں جو واقعہ بیان کیا جائے وہ صورت حال کے تقاضے کے عین مطابق ہو، انیس نے اپنے مراثی میں واقعات کربلا سے متعلق جتنے بھی واقعات اپنے شاعرانہ تخیل کے

ذریعہ پیش کئے ہیں، وہ سب حالات کے تقاضے کے عین مطابق ہیں جیسے حضرت علی اکبر اپنی والدہ سے جنگ کی اجازت لینے کے بعد حضرت زینب کے پاس اجازت لینے کے لیے آتے ہیں تو حضرت زینب فرماتی ہیں:

زینب نے کہا جس میں رضائے شہ والی — میں تو کوئی بات نہیں منھ سے نکالی
کیا غم ہے نہ پوچھا مجھے ماں سے تو رضا لی — مالک ہیں وہی میں تو ہوں اک پالنے والی
صدقے کئے فرزند پھوپھی سوگ نشیں ہے
سمجھے تو مراحق ہے نہ سمجھیں تو نہیں ہے

جذبات نگاری

جذبات انسانی کا بیان ایک مشکل کام ہے، کیونکہ جذبات انسانی کو ہم صرف محسوس کر سکتے ہیں دیکھ نہیں سکتے ہیں۔ جذبات انسانی کا بیان جتنا مشکل ہے انیس اس میں اتنے ہی کامیاب ہیں، انیس کے اصل جوہر یہیں پر کھلتے ہیں، مراثی میں رخصت اور بین کا حصہ زیادہ دردانگیز ہوتا ہے، لہٰذا وہ رخصت میں اپنے جوہر دکھاتے ہیں، وہ یہاں پر جذبات کی آپسی کشمکش بھی دکھاتے ہیں۔ محبت وحیا، غم وغصہ، شجاعت و پامردی، ادب اور فرض شناسی کے جذبات ان کے یہاں پر خوب نظر آتے ہیں۔ جیسے

آقا نے دی جو اپنے سر پاک کی قسم — بس تھرتھرا کے رہ گیا وہ صاحب کرم
پر تھی شکن جبیں پہ نہ ہوتا تھا غیض کم — چپ ہوگئے قریب جو آئے شہ امم
گردن جھکالی تا بہ ادب میں خلل پڑے
قطرے لہو کے آنکھ سے لیکن نکل پڑے

منظر نگاری

موازنۂ انیس و دبیر میں علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ میر انیس نے اگر چہ اس صنف میں دو تین مرثیے ہی لکھے ہیں لیکن انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ کمال کے درجے پر پہنچا دیا ہے، وہ انیس کی منظر نگاری کی تعریف کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں کہ عربی اور فارسی کی شاعری میں بھی اس قسم کے نمونے نہیں ملتے ہیں تو اردو شاعری کا تو بیان ہی کیا، دراصل بیانیہ شاعری میں فضا آفرینی کے لیے آس پاس کے مناظر کی خاصی اہمیت ہوتی ہے، انیس اپنے کردار کو مناظر کے درمیان اتنے سلیقے سے سجایا ہے کہ وہ وہاں سے ہٹا دئے جائیں تو وہ کردار اور ان سے وابستہ واقعات دھندلے پڑ جاتے ہیں، یعنی انیس اپنے کردار کو نمایاں کرنے کے لیے بھی مناظر فطرت کا ہی سہارا لیتے ہیں، اور مناظر کے بیان میں میر انیس نے طلوع صبح اور گرمی کے سماں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

وہ دشت، وہ نسیم کے جھونکے، وہ سبزہ وار — پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آب دار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار — بالائے ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے نخل گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

کردارنگاری

انیس کے مرثیوں کے تمام کرداران کے اپنے تخلیق کردہ نہ ہوکر تاریخی کردار ہیں اوران کے ساتھ ساتھ ان میں مذہبی جذبات بھی شامل ہیں۔انیس نے اپنے کرداروں کونمایاں کرنے کے لیے ان میں اعلیٰ انسانی صفات اوراقدار کوتلاش کیا ہے اور ان کے جذبات واحساسات کے بیان کے ذریعہ ان کونمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔گویا کہ مراثی انیس میں ہی تمام افراد اپنے اعلیٰ کردار کی وجہ سے نمایاں طور پر پیش ہوئے ہیں۔جیسے حضرت زینب اور حضرت عباس کا کردار حضرت عباس امام کے چھوٹے بھائی ہیں مگر مراثی انیس میں وہ ایک خادم اوروفادار بھائی کی حیثیت سے آئے ہیں حضرت عباس دریا کے کنارے پر خیمہ نصب کر نے کے لیے پھر رہے ہیں اور بہن زینب نہیں چاہتی کہ لڑائی ہواوران کے بھائی پر کوئی بھی آفت آئے،انیس نے زینب کا مکالمہ کس طرح سے پیش کیا ہے کہ ایک بہن اپنے بھائی پر سب کچھ قربان کرنے کی خاطر تیار رہتی ہے۔

صدقے ترے جلال کے اے میرے آفتاب — یاد آ گیا مجھے اسد اللہ کا عتاب
تم سے مقابلے کی جہاں میں کسے ہے تاب — جعفر ہو دبدبہ میں شجاعت میں بوتراب
یہ کیاہے رزم تو سد سکندر کو توڑ دو — لو ہم کو چاہتے ہو تو دریا کو چھوڑ دو
ہو جائے آج صلح کی صورت تو کل چلو
ان آفتوں سے بھائی کو لے کر نکل چلو

واقعہ نگاری

میر انیس اپنے مراثی میں ایک بہت بڑے واقعہ نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں، علامہ شبلی کا خیال ہے کہ میر انیس نے واقعہ نگاری کو جس کمال کے درجے تک پہنچایا ہے اردو کیا فارسی میں بھی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔انیس نے اپنے مراثی میں ہر طرح کے واقعات کونظم کیا ہے،مگر انیس کا خیال ہے کہ ان واقعات میں ہماری نظر صرف نمایاں پر ہی رہتی ہے،ان کے ذہن میں واقعہ نگاری لفاظی نہ ہوکر مرقع نگاری تھی،لہٰذا جب وہ کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں تو ہمارے سامنے اس کی پوری تصویر آجاتی ہے،انیس میدان جنگ کا نقشہ کھینچنے میں بہت ماہر ہیں،وہ ہیرو کی آمد دھوم دھام،رجز خوانی کا شور، شمشیر زنی اور نیزہ بازی کے ہنگاموں سے ایسی تصویر بناتے ہیں کہ میدان جنگ کا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔خیمہ حسین کا منظر اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ وہیں کی طرز معاشرت اور نفسیات کے خاکے اور انسانی زندگی کے رنگ نمایاں ہوتے ہیں۔جیسے

باتیں یہ سن کے روتی ہیں زینب جھکائے سر — تھرا رہی ہے زوجۂ عباس نام ور
چہرہ تو فق ہے گود میں ہے چاند سا پسر — مانع ہے شرم روتی ہے منھ پھیر پھیر کر
موقع نہ روکنے کا ہے نہ بول سکتی ہے
حضرت کے منھ کو نرگسی آنکھوں سے تکتی ہے

شعری محاسن

میر انیس نے اپنے کلام میں حسن وخوبی پیدا کرنے کے لیے تشبیہات اور استعارات کے جادو کا بھی سہارا لیا ہے۔ انیس نے عام طور پر مرکب تشبیہات استعمال کی ہیں کیونکہ یہ تشبیہات کلام میں نئے پن کا حسن پیدا کرتی ہیں۔تشبیہات کے استعمال سے انیس کا مقصد کلام میں سادگی اور برجستگی میں مزید لطف پیدا کرنا ہے۔اکثر مقامات پر انھوں نے کلام میں مبالغہ سے کام لینے کے لیے بھی تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔حضرت عباس پر چاروں طرف سے جب برچھیوں کی بوچھار ہو رہی تھی تو انیس نے اس واقعہ کو پر اثر بنانے کے لیے کسی شاعرانہ زبان کا استعمال کیا ہے۔مثلاً

یوں برچھیاں تھیں چاروں طرف جناب کے　　جیسے کرن کھلتی ہو گرد آفتاب کے

اسی طرح سے گرمی کی شدت کو بیان کرتے کہتے ہیں:

پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی　　ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

انیس کے طبیعت میں اعتدال تھا جس کی وجہ انھوں نے ان تمام صنعتوں کو جو کہ کلام کو پر تکلف بناتی ہیں نہایت ہی بے تکلفی کے ساتھ اس طرح استعمال کیا ہے کہ اس سے کلام کی سادگی اور برجستگی میں اضافہ ہو گیا ہے ان کی صنعت گری کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

مبالغہ:

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر　　بھن جاتا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

تضاد:

استادہ آگ میں یہ روانی خدا کی شان　　پانی میں آگ آگ یہ پانی خدا کی شان

مراعات النظیر :

ہر نخل برمند ہے یا حضرت باری　　پھل ہم کو بھی مل جائے ضیافت کا ہماری

لف ونشر:

کٹ کٹ کے ذوالفقار سے گرتے تھے خاک پر　　پہنچوں سے ہاتھ، شانوں سے بازو، تنوں سے سر

ایسی شاعری جس کی روایت محض حصول ثواب اور گریہ عوام پر مبنی ہو، جس کا پس منظر تاریخ اور مذہبی ہو اس کے اندر تخئیل کی کارفرمائی کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔مگر انیس کا کمال ہے کہ انھوں نے اعتقادی دائرے میں رہتے ہوئے صنف مرثیہ میں بڑی شاعری کی پہلو پیدا کئے ہیں، انیس نے جو مرثیہ نگاری کی جو طرز نکالی ہے وہ بالکل نئی ہے، وہ اس کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ان ہی تمام خصوصیات کی بنا پر انیس کا نام ادبی تاریخ میں ادب کے ساتھ لیا جائے گا۔

5.5 مرثیہ کے منتخب بند اور ان کی تشریح

(۱)

صبح صادق کا ہو چرخ پر جس وقت ظہور　　زمزمے کرنے لگے یاد الٰہی میں طیور
مثل خورشید برآمد ہوئے خیمے سے حضور　　یک بہ یک پھیل گیا چار طرف دشت میں نور
شش جہت میں رخ مولا سے ظہور حق تھا
صبح کا ذکر کیا چاند کا چہرہ فق تھا

تشریح: حضرت امام حسین کی شہادت والے دن (یعنی عاشورہ کے دن) کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب صبح صادق ہوتی ہے تو پرندے بھی اپنے معبود کی حمد وثنا میں مشغول ہو جاتے ہیں تو حضرت امام حسین بھی اپنے نورانی چہرے کے ساتھ اپنے خیمے سے باہر آتے ہیں جس کی وجہ ہر طرف ان کے چہرے کے نور سے اجالا ہو جاتا ہے، اور ہر طرف امام کے چہرے کے نور کی کرنیں پھیل رہی تھیں۔ ان کرنوں کی وجہ سے صبح کے خوبصورت منظر کا کیا ذکر چاند جو کہ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے جانا جاتا ہے اس کا چہرہ بھی ان کے حسن کی وجہ فق ہو رہا تھا۔

(۲)

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیاباں وہ سحر　　دم بہ دم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
اوس نے فرش زمرد پہ بچھائے تھے گہر　　لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر
دشت سے جھوم جب باد صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

تشریح: میر انیس اس بند میں بہترین منظر نگاری کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس وقت حضرت امام حسین نکلتے ہیں تو بتاتے ہیں کہ اس وقت صبح کا وقت بڑا ہی سہانا تھا ہر طرف ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں اور اس خوش گوار ماحول میں شجر بھی وجد کے عالم میں جھوم رہے تھے درختوں کے ساتھ شبنم کی وجہ سے سبزہ ایسا لگ رہا تھا جیسے شبنم کے قطرے نہ ہو کر گہر بکھرے پڑے ہوں اس سبزے کو دیکھنے کو بار بار طبیعت کرتی ہے۔ اسی خوشنما ماحول میں جب دشت میں بھی ایسا ہی سمان بنتا ہے تو اور جھوم کے بادصبا آتی ہے تو اسی باد صبا کی وجہ سے جب غنچے چٹکتے ہیں تو ان کے چٹکنے کی آوازیں صاف طور پر بھی سنائی دیتی ہے گویا کہ اس وقت کے خوبصورت منظر کی تصویر کشی کی ہے۔

(۳)

بلبلوں کی وہ صدائی وہ گلوں کی خوشبو　　دل کو الجھاتے تھے سنبل کے وہ پرخم گیسو
قمریاں کہتی تھیں شمشاد پہ یاہو یا ہو　　فاختہ کی یہ صدا سرو پہ تھی کو کو
وقت تسبیح کا تھا عشق کا دم بھرتے تھے
اپنے معبود کی سب حمد وثنا کرتے تھے

تشریح : صبح کے اس خوبصورت منظر میں انیس کہہ رہے ہیں کہ جب چاروں طرف اتنا حسین منظر ہے تو اس ماحول میں جہاں پر چاروں طرف گلوں کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے، سنبل کی خوشبو میں لوگوں کے دل الجھے ہوئے ہیں، قمریاں اور فاختائیں اور شمشاد سرو پر اپنی اپنی آوازوں میں خدا کے عشق کا دم بھرتے ہیں کیوں کہ یہ وقت حمد وثنا کا ہوتا ہے اور سب ہی اپنے معبود کی تعریف کر رہے ہیں۔

5.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

۱۔ میر انیس کے حالات مختصر زندگی لکھیے۔

۲۔ میر انیس کے کلام کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

5.7 فرہنگ

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
چرخ	آسمان	طیور	پرندے طیر کی جمع
یک بہ یک	اچانک	دشت	جنگل
شش	چھ	فق ہونا	رنگ اڑنا
بیاباں	جنگل	وجد	عالم مدہوشی
زمرد	ہرا رنگ	گہر	موتی
بادصبا	ٹھنڈی ہوا	سنبل	ایک خوشبودار گھاس
گیسو	زلف پر	خم	الجھے ہوئے
قمری	فاختہ کی ایک قسم	شمشاد	ایک درخت کا نام
سرو	ایک خوبصورت درخت جو کہ بالکل سیدھا جاتا ہے		

5.8 معاون کتب

۱۔ مقدمہ شعروشاعری الطاف حسین حالی

۲۔ موازنہ انیس ودبیر علامہ شبلی نعمانی

اکائی 6 اردو نظم: تعارف اور صنفی خصوصیات

اکائی کے اہم اجزا

6.1 اغراض ومقاصد

6.2 تمہید

6.3 روایتی نظم اور جدید نظم

6.4 نظم کی تعریف

6.5 جدید نظم کے اہم امور

6.6 ہئیت کے اعتبار سے نظم کی قسمیں

6.7 نمونہ برائے امتحانی سوالات

6.8 فرہنگ

6.9 معاون کتب

6.1 اغراض ومقاصد

نظم ایک جدید صنف ہے۔ جس کی فنی تکنیک کے بارے میں طلبا کو بہت کم علم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری بلاغت کی کتابوں میں نظم کے معنی جملہ اصنافِ شاعری کے ہیں۔ جب کہ جدید نظم، تمام اصنافِ شاعری سے ایک مختلف صنفِ سخن ہے جس کے اپنے فنی تقاضے ہیں۔ طلبا کو یہ بتانا مقصود ہے کہ جدید نظم کا فن کیا ہے۔ اس کی کس طرح اور کن لفظوں میں تعریف کی جاسکتی ہے۔ اس کی ان ہیئتوں کے بارے میں بھی علم مہیا کرانا مقصود ہے جو بیسویں صدی میں ارتقا پائی ہیں، جیسے معریٰ نظم اور آزاد نظم۔

اس اکائی کو پڑھ لینے کے بعد طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ روایتی نظم اور جدید نظم کے فرق کو واضح کر سکیں
- ☆ نظم کی تعریف بیان کر سکیں
- ☆ جدید نظم کے اہم امور کی وضاحت کر سکیں
- ☆ ہئیت کے اعتبار سے نظم کی قسموں کا جائزہ لے سکیں۔

6.2 تمہید

انیسویں صدی کے اواخر میں جن نئی اصناف نے ہمارے ادب میں ایک مستقل جگہ بنالی ان میں نظم بھی ہے۔ ایسا نہیں

ہے کہ نظم، اسی طرح ہمارے لیے ایک ایسا لفظ ہے جو پہلے موجود نہیں تھا۔ جیسے ناول، ڈرامہ، تنقید وغیرہ۔ افسانہ کا شمار بھی نئی اصناف کے ذیل میں کیا جاتا ہے لیکن اس لفظ سے ہم پہلے سے مانوس تھے۔ اس بات کا ہمیں علم ہونا چاہیے کہ ہماری بلاغت کی کتابوں میں نظم سے جملہ شاعری مراد لی جاتی ہے اور غزل، مثنوی، قصیدہ وغیرہ اصناف نظم کے ذیل میں شمار کی جاتی ہیں۔ ان تمام اصناف کے اپنے فنی قواعد ہیں، ان کی اپنی ایک تاریخ بھی ہے جب کہ نظم کا تصور بہ حیثیت ایک صنف کے ان تمام دوسری اصناف سے مختلف اور نیا ہے۔

6.3 روایتی نظم اور جدید نظم

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نظم ہمارے یہاں بھی پہلے سے موجود تھی۔ ثبوت کے لیے قلی قطب شاہ سے لے کر نظیر اکبر آبادی تک جو نظمیں موضوعات پر لکھی گئی تھیں ان کا شمار نظم کے ذیل میں ہونا چاہیے۔ یہ بات صرف ایک حد تک درست ہے کیونکہ حالی اور آزاد کی نظموں اور ان سے پہلے کے شعرا کی نظموں میں کئی اعتبار سے اختلاف پایا جاتا ہے۔ روایتی نظمیں درج ذیل خصوصیات کی حامل ہیں:

(1) یہ نظمیں کسی ایک جلی عنوان کے تحت لکھی گئی ہیں۔

(2) ان نظموں میں کسی ایک ہیئت کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔

(3) ان نظموں میں موضوع کی بھی قید نہیں ہے۔ جیسے قصیدہ یا مرثیہ اپنے موضوع سے پہچانا جاتا ہے۔

(4) ان نظموں میں جن ہیئتوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ وہ غزل، مثنوی سے اخذ کی گئی ہیں یا ہمارے یہاں جو مستعمل شعری ہیئتیں ہیں ان کو کام میں لیا گیا ہے۔ جیسے مطلع بند ترکیب، مثلث، مخمس اور مسدس وغیرہ تراکیب استعمال۔

(5) ان نظموں میں داخلی ارتقا نہیں پایا جاتا۔ داخلی ارتقا کا امکان وہاں ہوتا ہے جہاں خیال تسلسل کے ساتھ واقع ہوتا ہے۔

(6) ان نظموں میں ایک مصرع دوسرے مصرعے سے ایک بند دوسرے بند سے خیال کے لحاظ سے مربوط نہیں ہوتا۔

(7) ان نظموں کے درمیان سے اگر کوئی شعر یا بند نکال دیا جائے تو بھی نظم کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

درج بالا خصوصیات کو ذہن میں رکھ کر جدید نظم کا مطالعہ کیا جائے تو اس کی خصوصیات کو اس طرح مرتب کیا جا سکتا ہے:

(1) جدید نظم بھی کسی ایک عنوان کے تحت لکھی جاتی ہے۔ لیکن ایسی بھی نظمیں لکھی گئی ہیں، جو عنوان سے عاری ہیں۔

(2) ان نظموں میں بھی کسی مخصوص ہیئت کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔

(3) ان نظموں میں بھی کسی خاص موضوع کی قید کی پابندی نہیں ہوتی۔ حیات و کائنات کے کسی بھی موضوع اور زندگی کے کسی بھی تجربے اور جذبے کو موضوع کے طور پر اخذ کیا جا سکتا ہے۔

(4) ان نظموں میں روایتی ہیئتوں کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں تھوڑی بہت تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں، اس قسم کی نظمیں بیسویں صدی کے نصف اوّل میں پوری ایک تاریخ رکھتی ہیں۔ نصف اوّل ہی میں ہیئتی تجربے بھی کیے گئے ہیں۔ معری اور آزاد نظم کا چلن عام ہوا۔ نثری نظمیں بھی لکھی گئیں اور موجودہ عہد میں نثری نظم کو کئی شعرا نے اپنے اظہار کا وسیلہ بھی بنایا ہے۔

(5) جدید نظم میں تسلسل کو خاص اہمیت دی جاتی ہے جس کے باعث وہ لخت لخت ہونے سے بچ جاتی ہے۔ جیسا کہ روایتی نظم میں ہوا کرتا تھا۔ اگر یہ تسلسل نہ ہو تو نظم میں داخلی ارتقا کی صورت بھی پیدا نہیں ہو سکتی اور داخلی ارتقا کا شمار نظم میں بنیادی شرط کے طور پر کیا جاتا ہے۔

(6) روایتی نظم کے مقابلے میں جدید نظم کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ پوری طرح مربوط ہوتی ہے۔

(7) ان نظموں کے درمیان سے کسی ایک مصرعے یا کسی ایک بند کو بھی نہیں نکالا جا سکتا۔ کیونکہ نظم کا ہر جُز دوسرے جُز کے ساتھ زنجیر کی کڑیوں کی طرح جڑا ہوتا ہے۔

6.4 نظم کی تعریف

احتشام حسین کے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ:

> ''نظم کا لفظ جب شاعری کی ایک مخصوص صنف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے وہ نظمیں مقصود ہوتی ہیں جن کا کوئی معین موضوع ہو اور جن میں بیانیہ فلسفیانہ یا متفکرانہ انداز میں شاعر نے کچھ خارجی اور کچھ داخلی یا دونوں قسم کے تاثرات پیش کیے ہوں۔''

درج بالا اقتباس میں صرف ایک معین موضوع اور بیانیہ انداز پر زور دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی داخلی قسم کے تاثرات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ روایتی نظموں کے موضوعات خارجی نوعیت کے ہوا کرتے تھے۔ جیسے موسم بہار، محبت، ہولی، دیوالی وغیرہ۔ داخلی قسم کے مضامین و موضوعات کی طرف ان شعرا کی کوئی توجہ نہ تھی۔ جدید نظم کے موضوعات کا دائرہ اسی لیے وسیع ہے کہ اس میں داخلی انسانی تجربوں اور جذبوں کا رنگ بھی شامل ہے۔

روایتی نظم نگار محض خارجی موضوعات ہی پر اکتفا نہیں کرتا تھا بلکہ ان کا اظہار بھی معروضی طور پر کرتا تھا۔ اس موضوع سے اس کی ذہنی اور رسومیاتی Conventional نسبت کا تو پتہ چلتا ہے، لیکن اس کی ذات کا کوئی عکس اس میں شامل نہیں ہوتا تھا۔ اسی لیے ان نظموں میں بیان کی کیفیت حاوی ہے۔ اس موضوع نے ان کے دل پر کیا اثر قایم کیا، ان کے کن جذبوں کو اس نے تحریک دی، اس کا پتہ نہیں چلتا۔ جب کہ شاعری کی زبان کے لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی زبان جذباتی Emotive ہوتی ہے یا ہونی چاہیے جو موضوع کے تعلق سے شاعر کی شمولیت Involvement کو ظاہر کرتی ہے۔ فکر یا خیال کو محسوس بنانے کی راہ بھی جذباتی زبان سے ہو کر جاتی ہے۔ شاعری وہاں شعریت سے عاری ہونے لگتی ہے جہاں محض فکر کی ادائیگی شاعر کا مقصود بن جاتی ہے۔ شاعر فکرِ محض کے بجائے فکرِ محسوس کا نام ہے۔ درج ذیل نظم میں بیان تو ہے، شاعر کی ذات کا کوئی عکس دکھائی نہیں دیتا اور نہ زبان میں جذبے کا رنگ شامل ہے۔ نظم کا عنوان ہے 'برسات کی بہاریں' اور شاعر ہیں نظیر اکبر آبادی:

ہیں اس ہوا میں کیا برسات کی بہاریں — سبزوں کی لہلہاہٹ، باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھم جھماوٹ، قطرات کی بہاریں — ہر بات کے تماشے، ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر، ہو مست چھا رہے ہیں　　جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہرجا، جل تھل بنا رہے ہیں　　گل زار بھیگتے ہیں، سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہے یارو، برسات کی بہاریں

جنگل سب اپنے تن پر ہریالی سج رہے ہیں　　گل بوٹے، جھاڑ بوٹے، کرا پنی دھج رہے ہیں
بجلی چمک رہی ہے، بادل گرج رہے ہیں　　اللہ کے نقارے نوبت کے بج رہے ہیں
کیا کیا مچی ہے یارو، برسات کی بہاریں

درج بالا تینوں بندوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ برسات کے موسم میں اردگرد کا سارا ماحول کتنا رنگا رنگ اور شاداب ہو جاتا ہے۔ شاعر اس پوری صورت حال کی بڑی بے تکلفی کے ساتھ تصویر کشی کر رہا ہے۔ لیکن غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ شاعر نے جو پہلے بند میں کہا ہے، اسی کو دوسرے لفظوں میں بعد کے بند میں ادا کر رہا ہے، اسی قسم کی تکرار تیسرے بند میں پائی جاتی ہے۔ چاروں طرف ہریالی ہے، بارش کی بوندا باندی سے سارے باغات اور جنگل تر بہ تر ہو گئے ہیں۔ بادل گرج رہے ہیں، بجلیاں چمک رہی ہیں۔ بادل ہوا میں مست و بے خود ادھر سے اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ ہر طرف جل تھل ہی جل تھل ہے۔ برسات کی بہاروں کا یہ رنگ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ بعد کی تمام بندوں میں نظر آتا ہے۔ شاعر لطف لے لے کر منظر کشی کی طرف مائل ہے۔ ایک مضمون کو سو رنگ میں باندھا گیا ہے۔ شاعر کہیں اپنا ردِّ عمل یعنی وہ جذباتی ردعمل نہیں پیش کر رہا ہے جس میں کچھ نہ کچھ ذات کا عکس بھی شامل ہوتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم میں 'برسات کی بہار' ایک خارجی تجربہ ہے جس کی رنگا رنگ تصویر شاعر نے اسی طرح پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس طرح کسی کھیل یا واقعے کی روداد Commentary پیش کی جاتی ہے اور کامینٹیٹر یعنی مبصر کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ وہ صرف روداد بیان کرے، اپنی طرف سے کوئی ردعمل پیش نہ کرے۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم میں بھی ایک ایسی ہی کامینٹری کی کیفیت ہے۔

یہاں ہم یہ ضرور بتانا چاہیں گے کہ ان نظموں کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ ہماری یہی روایت رہی ہے۔ نظموں کا یہ اثاثہ ہمارے ادب کی تاریخ کا بہت اہم باب ہے۔ تسلسل یا ارتقا کی کمی کے باوجود یہ نظمیں ہم اہلِ مشرق کو متاثر کرتی ہیں۔ ان سے شاعر کی قدرتِ کلامی کا پتہ چلتا ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے ہماری شاعری نے جو ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ یہ نظمیں ان کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ان نظموں نے اردو شاعری کے موضوعات کے دائرے کو وسیع کیا۔ دوسری اصناف کے موضوعات یا ہیئتیں مخصوص تھیں۔ روایتی نظم مختلف شعری ہیئتوں کو بروئے کار لائی۔ یہ صورت صرف قدیم شعرا ہی کے ہاں نظر نہیں آتی بلکہ بیسویں صدی کے شعرا کے یہاں بھی دکھائی دیتی ہے جب کہ حالی اور آزاد کے بعد جدید نظم کا تصور واضح ہو چکا تھا۔ جوش ملیح آبادی، سیماب اکبر آبادی، ساغر نظامی، افسر میرٹھی، چکبست لکھنوی اور درگا سہائے سرور کی اکثر نظموں میں روداد کی کیفیت حاوی ہے۔ ان نظموں کو قدیم روایتی نظموں کے پہلو بہ پہلو بھی نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ ان میں کسی حد تک شخصی رنگ شامل ہے۔ شاعر کا نقطۂ نظر یا زندگی کے تعلق سے اس کا نظریہ بھی کسی حد تک ان نظموں سے عیاں ہے۔

6.5 جدید نظم کے اہم امور

موضوع کی بحث کے بعد اب ہم نظم میں ارتقائے خیال کے موضوع پر غور کریں گے۔ جیسا کہ اس سے قبل بتایا

جاچکا ہے کہ جدید نظم کے تقاضے روایتی نظم کے مقابلے میں الگ ہیں۔ احتشام حسین نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ:

''جب نظم کا لفظ شاعری کی ایک خاص صنف کے لیے استعمال کیا ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے اشعار کا ایسا مجموعہ جس میں ایک مرکزی خیال ہو اور ارتقائے خیال کی وجہ سے تسلسل کا احساس پیدا ہو سکے۔ اس کے لیے کسی خاص موضوع کی قید نہیں اور نہ اس کی ہیئت ہی معین ہے۔''

(عکس اور آئینے، ص 37)

احتشام حسین نے درج ذیل چار امور نظم کے لیے ضروری بتائے ہیں:

1. مرکزی خیال
2. ارتقائے خیال اور تسلسل
3. موضوع کے انتخاب میں آزادی
4. ہیئت کا غیر معین ہونا

یہی وہ امور ہیں جنھیں اکثر موضوعِ بحث بنایا جاتا ہے اور تقریباً تمام ناقدین ان امور پر اتفاق کرتے ہیں۔ ہم ان پر علیحدہ علیحدہ غور کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ جدید نظم میں ان چیزوں کا کہاں تک خیال رکھا جاتا ہے:

1. مرکزی خیال

مرکزی خیال سے مراد زندگی کے کسی ایک تجربے کو بنیاد بنانا جس سے شاعر کا کوئی جذباتی تعلق ہوتا ہے یا کوئی ایسی کیفیت ہوتی ہے جو اپنا اظہار چاہتی ہے۔ حتیٰ کہ کسی چیز کو دیکھ کر جو ردِعمل پیدا ہوتا ہے اسے بھی شعری زبان میں ادا کیا جاتا ہے۔ وہ تاثر بھی نظم میں ایک خیال کی صورت میں بنیاد بن جاتا ہے۔ بعض نظموں میں مرکزی خیال کی بنیاد پر عنوان بھی قایم کیا جاتا ہے جو پہلے سے پڑھنے والے کے ذہن میں نظم کے مرکزی خیال کا ایک دھندلا سا خاکہ پیدا کر دیتا ہے۔ تجرباتی نظموں میں 'ناراست' عنوان کا چلن ہے۔ یعنی ضروری نہیں کہ پڑھنے والے کے ذہن میں عنوان کو پڑھ کر جو خیال پیدا ہوا ہو۔ وہ ہو بہو اس کا مرکزی خیال ہو۔ عنوان ہو یا نہ ہو، وہ راست ہو یا ناراست۔ نظم میں مرکزی خیال کا ہونا ضروری ہے۔ مرکزی خیال کی شکل ایک محور کی ہوتی ہے جس پر نظم گردش کرتی ہے اور وہ ادھر اُدھر بھٹکتی نہیں۔ مرکزی خیال نظم کی شیرازہ بندی کا کام کرتا ہے۔ مثلاً اختر الایمان کی یہ مختصر نظم دیکھیے جس کا عنوان ہے 'تسکین':

اِک محقق نے انسان کو بوزنہ جب کہا
میں وہیں سجدۂ شکر میں گر گیا
اپنی کوتاہیوں، خامیوں کے لیے
آفرینش سے اب تک جو شرمندہ تھا
آج وہ بوجھ، بارے ذرا کم ہوا

اس نظم کا عنوان 'تسکین' ہے۔ 'تسکین' سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ شاعر اس سے کیا مراد لے رہا ہے اور اس کے 'تسکین' کی

وجہ یا وجوہ کیا ہیں۔ یعنی عنوان پڑھ کر ہمارے ذہن میں کوئی خیال ہی پیدا نہیں ہوتا، اگر ہوتا بھی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ شاعر نے 'تسکین' کے لیے وہی جواز پیش کیا ہو جو آپ کے ذہن میں پیدا ہوا ہے۔ نظم کا مرکزی خیال بس اتنا ہے کہ انسان میں طبعی طور پر کمیاں پائی جاتی ہیں۔ شاعر کو ایک دلیل اس محقق (یعنی ڈارون) سے مل گئی کہ وہ پہلے کبھی بندر تھا، ترقی پا کر انسان کی شکل اس نے پائی ہے۔ جب اسے یہ دلیل مل گئی تو اب اسے یہ شرمندگی نہ رہی کہ وہ نامکمل اور ادھوار ہے یا اس میں کوتاہیاں اور خامیاں ہیں۔ یہی چیز اس کے لیے تسکین کا سامان بن گئی۔ نظم میں شاعر نے 'سجدۂ شکر میں گرنے' کی بات کہہ کر خدا پر بھی طنز کیا ہے کہ اسی نے حضرتِ انسان کو کوتاہ پیدا کیا ہے۔ کہنے کا مقصود یہ کہ یہ نظم اپنے مرکزی خیال سے ذرا نہیں ہٹی۔ اسی باعث اس میں برجستگی اور چستی بھی پائی جاتی ہے۔

2. ارتقائے خیال

ارتقائے خیال سے مراد مرکزی خیال کا ایک خاص رفتار کے ساتھ ارتقا۔ نظم میں ارتقا اسی وقت قائم رہتا ہے جب اس میں ہر مصرعہ یا سطر دوسرے مصرعے سے پوری طرح مربوط ہو۔ اسے شروع سے آخر تک ایک ایسی زنجیر کی شکل اختیار کر لینا چاہیے جس کی تمام کڑیاں ایک دوسرے سے پیوست ہوں۔ لیکن کسی خیال کو تسلسل کے ساتھ پیش کرنے کا نام ارتقا نہیں ہے۔ اس میں نشیب و فراز بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ دوسرے ملتے جلتے خیالات بھی اس میں وارد ہو سکتے ہیں۔ یہ خیالات بھی نظم کے مرکزی خیال کی زمین ہی سے پھوٹنے چاہئیں اور انھیں نظم میں مزید معنی خیزی کا باعث ہونا چاہیے۔ دیکھیے اختر الایمان کے درج ذیل نظم میں ہر مصرعہ دوسرے مصرعے کے ساتھ پوری طرح پیوست ہے۔ درمیان سے کسی ایک مصرعے کو بھی نکالا نہیں جا سکتا۔ نظم میں نہ صرف تسلسل ہے بلکہ ایک منطقی ارتقا یعنی ارتقائے خیال بھی پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے پوری نظم ایک وحدت میں ڈھل گئی ہے۔ نظم کا عنوان ہے 'اعتماد':

بولی خودسر ہوا، ایک ذرہ ہے تو
یوں اڑا دوں گی میں، موجِ دریا بڑھی
بولی میرے لیے ایک تنکا ہے تو
یوں بہا دوں گی، میں آتشِ تند کی
اک لپٹ نے کہا، میں جلا ڈالوں گی
اور زمیں نے کہا، میں نگل جاؤں گی
میں نے چہرے سے اپنے اُلٹ دی نقاب
اور ہنس کر کہا، میں سلیمان ہوں
ابنِ آدم ہوں میں یعنی انسان ہوں

شاعر نے دراصل آخری دونوں مصرعوں کے لیے نظم کی عمارت کھڑی کی ہے۔ اس کا عنوان 'حضرتِ انسان' یا 'انسان کی عظمت' بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن شاعر نے ناراست عنوان رکھا ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ فطرت پر انسان فوقیت رکھتا ہے۔ انسان

صدیوں سے فطرت کو تراشتا آ رہا ہے، تا کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکے۔ اس خیال کو شاعر نے بڑی فن کاری اور ڈرامائیت کے ساتھ مصرعہ بہ مصرعہ آگے بڑھایا ہے۔ آخری مصرعہ یک لخت ہمیں چونکا دیتا ہے۔

3. موضوع کے انتخاب میں آزادی

اس مسئلے پر 'موضوع' کے ذیل میں پہلے ہی طویل بحث ہو چکی ہے۔ مختصر یہ کہ نظم، ان اصناف میں سے ہے، جو کسی خاص موضوع کے ساتھ وابستہ نہیں ہے، جیسے مرثیہ اور قصیدہ کے موضوعات مخصوص ہیں۔ نظم نگار کو یہ آزادی ہے کہ وہ زندگی کے کسی بھی تجربے کو نظم کا موضوع بنا سکتا ہے۔ یہ موضوع خارجی بھی ہو سکتا ہے اور داخلی بھی۔ داخلی سے مراد کسی بھی انسانی جذبے سے متعلق ہو سکتا ہے۔

4. ہیئت کا غیر معین ہونا

نظم کی یہ سب سے اہم اور بنیادی خصوصیت ہے کہ وہ کسی بھی شعری ہیئت میں لکھی جا سکتی ہے۔ ہمارے یہاں قصیدہ کی اپنی ہیئت جو غزل کی ہیئت میں لکھا جاتا ہے۔ مثنوی مطلع بند ہوتی ہے اور اس کی بحریں مخصوص ہیں۔ مثنوی کے لیے کسی موضوع کی قید نہیں ہے۔ غزل کے لیے بھی کسی مخصوص موضوع کی قید نہیں ہے لیکن عام طور پر غزل کو عشقیہ شاعری کے لیے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ غزل میں ہر طرح کے مضامین باندھے جاتے ہیں اور باندھے جا سکتے ہیں۔ تاہم غزل کی اپنی ایک خارجی ہیئت ہے۔ جیسے اس کا پہلا شعر مطلع بند ہوتا ہے اور ردیف و قافیے کا جو اہتمام مطلع میں کیا گیا ہے۔ ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں اس کی پابندی ہے۔ آخری شعر میں شاعر اپنے تخلص کا استعمال کرتا ہے۔ جسے مقطع کہتے ہیں۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ موجودہ دور میں مطلع اور مقطع کی پابندی بھی نہیں کی جاتی۔ لیکن ردیف اور قافیے کا لحاظ ضرور رکھا جاتا ہے۔ آزاد غزل کے جو تجربے کیے گئے ہیں وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔

6.6 ہیئت کے اعتبار سے نظم کی قسمیں

نظم کی تاریخ میں بھی بڑے انقلاب واقع ہوتے رہے۔ بالخصوص اس کی ہیئت کے ضمن میں مختلف قسم کے تجربات ہوتے رہے ہیں۔ نظم کے ارتقا کی تاریخ کے تین واضح مدارج رہے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

1. پابند نظم
2. معریٰ نظم
3. آزاد نظم

1. پابند نظم

پابند نظم سے مراد وہ نظم ہے جس میں بحر کی پابندی ہوتی ہے۔ مسدس، مثلث، مربع مخمس یا اس سے زیادہ مصرعوں پر مبنی

ہوتی ہے۔ یا جس میں غزل یا مثنوی کی ہیئتیں اختیار کی گئی ہیں۔ بعض شعرا نے ٹیپ کے مصرعے کا بھی اہتمام کیا ہے۔ بعض شعرا نے گیت کا انداز بھی اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال نے اپنی نظموں میں مسدس کے فارم کو بھی برتا ہے اور ایسے بندوں پر مشتمل نظمیں بھی کہی ہیں جو سات سات آٹھ آٹھ اشعار کے حامل ہیں جیسے 'مسجد قرطبہ' کا یہ پہلا بند دیکھیے:

سلسلۂ روز و شب، نقش گرِ حادثات — سلسلۂ روز و شب، اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب، تارِ حریرِ دورنگ — جس سے بناتی ہے ذات، اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب، سازِ ازل کی فغاں — جس سے دکھاتی ہے ذات، زیر و بم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ — سلسلۂ روز و شب، صیرفیِ کائنات
تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار — موت ہے تیری برات، موت ہے مری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا — ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات
آنی و فانی تمام، معجزہ ہائے ہنر — کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات
اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا

(متاعِ سخن، مرتبہ: ڈاکٹر عبدالحق، ص333)

گیت کے انداز میں تلوک چند محروم کی نظم 'تصویرِ بہار' کا یہ پہلا بند دیکھیں:

دامنِ کوہسار سے — ساحلِ رودبار تک
ساحلِ رودبار سے — دامنِ کوہسار تک
مسندِ شاہدِ بہار — تختۂ سبز ہ زار ہے
شبنمِ تر سے کشت زار — تختِ گہرنگار ہے
مظہرِ جلوۂ طرب — ساحتِ روزگار ہے
روح نواز کس قدر — نغمۂ آبشار ہے
منظرِ صافِ سطحِ آب — آئینۂ بہار ہے
دشت میں الغرض عیاں — قدرتِ کردگار ہے

(ایضاً، ص363)

درج ذیل مجاز کی نظم 'آوارہ' میں ہر بند کا چوتھا مصرعہ ٹیپ کا مصرعہ ہے جو پوری نظم میں اسی طرح بار بار دہرایا گیا ہے:

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

(ایضاً،ص361)

2. معریٰ نظم

معریٰ نظم کو 'بلا قافیہ' نظم بھی کہا جاتا ہے۔اس طرح کی نظمیں بیسویں صدی کے نصف اوّل میں لکھنے کا رواج زیادہ تھا۔ اردو نظم کی تاریخ میں معریٰ نظم بھی بہت بڑا اقدام تھی۔مغرب میں معرّی نظم کی تاریخ بہت پرانی ہے۔اردو میں بیسویں صدی کے ربع اوّل میں اس قسم کے تجربے کیے گئے تھے جو بے حد کامیاب ثابت ہوئے۔معریٰ نظم بھی ایک اعتبار سے پابند نظم ہی ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں قافیے کی پابندی کو قایم نہیں رکھا جاتا۔اختر الایمان کی جن دو نظموں کی مثالیں اوپر درج کی گئی ہیں وہ معریٰ ہی میں ہیں۔یہاں اختر الایمان ہی کی نظم 'پھیلاؤ' درج ذیل ہے جو معریٰ میں ہے:

جب مرے جسم سے کونپلیں پھوٹ کر
دھیرے دھیرے تناور شجر بن گئیں
اور پھل پھول دینے لگیں، تب مجھے
ایک احساسِ گیرائی ایسا ہوا
جیسے جو بھی زمیں پر ہے سب میرا ہے
اس کے غم، اس کی خوشیاں بھی سب میری ہیں
اس کی تنہائیاں، بے بسی، کرب، سب
جو بھی اس کا مقدر ہے سب میرا ہے
صرف میری وجہ سے ہے، خالق ہوں میں—
ہر کم و بیش کا، جیسے میں ہوں زمیں
اور جیسے کہ میں خود ہی دہقان ہوں

(سروساماں:اختر الایمان،ص510)

اس نظم پر غور کریں۔اس میں شاعر نے پابندی کے ساتھ قافیے کا التزام نہیں رکھا ہے۔پانچویں اور آٹھویں مصرعے میں اتفاق سے قافیہ در آیا ہے۔ورنہ پوری نظم معریٰ میں ہے۔

3. آزاد نظم

معریٰ کی تکنیک میں لکھی جانے والی نظموں نے ابھی رواج پایا ہی تھا کہ آزاد نظم کا تجربہ بھی عمل میں آیا۔آزاد نظم پورے

طور پر آزاد نہیں ہوتی۔ یہ بھی بحر اور وزن کے مطابق ہوتی ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ بحر تو ایک ہوتی ہے۔ ہر مصرعے میں ارکان کی کمی بیشی واقع ہوتی ہے، جس سے بعض لوگوں کو یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ بحر و وزن سے آزاد ہوتی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے معریٰ اور آزاد نظم کے فرق کے بارے میں لکھا ہے:

''نظم معریٰ اور آزاد نظم پابند نظم کے مقابلے میں 'آزاد' ہیں لیکن ان کے علیحدہ اصول وضوابط ہیں۔ نظم معریٰ میں صرف ردیف و قافیہ کی پابندی نہیں کی جاتی ورنہ تمام مصرعے برابر ہوتے ہیں اور نظم آزاد میں ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا ہے یعنی مصرعے چھوٹے بڑے ہو سکتے ہیں لیکن ان میں بحر ایک ہوتی ہے۔ مصرعوں میں ارکان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ کسی طویل نظم کے مختلف ابواب کو ہم علیحدہ علیحدہ بحروں میں بھی لکھ سکتے ہیں۔''

(اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم: ڈاکٹر حنیف کیفی، ص193)

(اردو نظم اور اس کے امکانات، مطبوعہ علی گڑھ میگزین، شمارہ اول 1957، ص199)

خلیل الرحمٰن اعظمی کا کہنا بھی یہی ہے کہ:

1. نظم معریٰ اور آزاد نظم دونوں میں ردیف و قافیے کی پابندی نہیں کی جاتی۔
2. معریٰ میں تمام مصرعے برابر ہوتے ہیں جب کہ آزاد نظم میں مصرعے چھوٹے بڑے ہو سکتے ہیں۔
3. آزاد نظم اور معریٰ دونوں میں بحر ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن آزاد نظم کے مصرعوں میں ارکان کی کمی بیشی واقع ہوتی ہے۔
4. اگر نظم طویل ہے اور اسے الگ بندوں (یا ابواب) میں تقسیم کیا گیا ہے تو معری ہو یا آزاد نظم علیحدہ علیحدہ بحروں میں بھی لکھی جا سکتی ہے۔ اب ہم یہاں آزاد نظم کی ایک مثال درج ذیل کرتے ہیں۔ اس مثال کے ذریعے یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ آزاد نظم کی ظاہری ہیئت کس قسم کی ہوتی ہے۔

یہ کمار پاشی کی نظم ہے، جس کا عنوان ہے 'جنم دن':

آسماں کی وسعتوں میں
میری نظریں
ڈھونڈتی ہیں، اس حسیں ماضی کو، جس کی
یاد کے سائے بھی گھلتے جا رہے ہیں اب ہوا میں
اور میری آنکھوں سے اوجھل ہو رہے ہیں لمحہ لمحہ
میں پرانا سا کوئی انسان ہوں، محسوس یہ ہوتا ہے مجھ کو
میں نے ہر ساون میں دھویا ہے بدن کو
اور یہ دھرتی مجھے روزِ ازل سے جانتی ہے
یاد ہے وہ دن مجھے اچھی طرح سے
کھولتے، چنگھاڑتے لاوے کے بے پایاں سمندر سے اچھل کر

ہم اکٹھے ہی گرے تھے
اور صدیوں بعد ہوش آیا، کھلی جب آنکھ میری
مَیں نے دیکھا:
مَیں تو صدیوں پہلے پیدا ہو چکا تھا
'جنم دن': کمار پاشی

(ترجیحات، ص254 تا255)

6.7 نمونہ برائے امتحانی سوالات

(1) نظم کی تعریف کیجیے۔
(2) روایتی نظم کی کیا خصوصیات ہیں؟
(3) جدید نظم کی کیا خصوصیات ہیں؟
(4) معریٰ نظم کسے کہتے ہیں؟
(5) آزاد نظم کسے کہتے ہیں؟

6.8 فرہنگ

مانوس	جانا پہچانا	مربوط	ایک دوسرے کے ساتھ بندھا ہوا
التزام	پابندی	عاری	کوری، خالی
درآنا	اندر داخل ہونا	لخت لخت	ٹکڑے ٹکڑے
معین	مقرر	یک لخت	ایک دم

6.9 معاون کتب

اردو میں معرا اور آزاد نظم	ڈاکٹر حنیف کیفی
عکس اور آئینے	پروفیسر سید احتشام حسین
اصنافِ سخن اور شعری ہیئتیں	شمیم احمد
اردو نظم کا سفر	خلیل الرحمٰن اعظمی

اکائی 7 آدمی نامہ (نظیر اکبرآبادی)

اکائی کے اہم اجزا

7.1 اغراض ومقاصد

7.2 تمہید

7.3 نظیر اکبرآبادی کا تعارف

7.4 آدمی نامہ کی تشریح وتجزیہ

7.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

7.6 فرہنگ

7.7 معاون کتب

7.1 اغراض ومقاصد

اردو شاعری کی تاریخ میں نظیر اکبرآبادی کا نام کئی اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے طلبہ کے لیے وہ ایک جانا پہچانا نام ہے۔ انھیں یہ بخوبی علم ہے کہ نظیر اکبرآبادی ایک بڑے شاعر ہیں۔ ان کی بعض خوبیوں کے بارے میں بھی وہ آگاہ ہیں۔ ان کی نظمیں بھی سادہ وسلیس ہیں۔ لیکن ان نظموں کی سادگی میں بھی گہرائی ہے۔ ان کی زبان پر مقامی تہذیب اور مقامی بولی کا گہرا اثر ہونے کی وجہ سے اکثر اوقات انھیں سمجھنا مشکل بھی ہوجاتا ہے۔ اس قسم کی نظموں میں 'آدمی نامہ' کا بھی شمار ہوتا ہے۔ طلبہ میں یہ نظم بہت معروف سمجھی جاتی ہے، لیکن بند بہ بند جب اس نظم پر غور کیا جاتا ہے تو زبان کے اعتبار سے کچھ دقتیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ یہ زبان قدرے اجنبی معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہماری غزل کی روایت میں پلی بڑھی شاعری کی زبان سے یہ بالکل مختلف ہے۔ طلبہ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ نظیر اکبرآبادی نے 'نظم کی زبان' کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ایک ایسی زبان جو عام تکلفاتِ شعری سے مختلف ہے اور جو فارسی لفظیات اور فارسی تراکیب سے بھی عاری ہے۔ ہمارا مقصد طلبہ میں نظم کا ذوق پیدا کرنا ہے تاکہ وہ غزل اور نظم میں فرق پیدا کرسکیں اور نظیر کے بعد جو نظمیں لکھی گئیں ان کی طرف وہ راغب ہوسکیں۔

اس اکائی کو پڑھ لینے کے بعد طلبہ اس قابل ہوجائیں گے کہ وہ:

☆ نظیر اکبرآبادی کا تعارف کراسکیں

☆ آدمی نامہ کی تشریح وتجزیہ کرسکیں۔

7.2 تمہید

نظیر اکبرآبادی ایک ممتاز نظم گو شاعر ہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ میں ان کا ایک اہم مرتبہ ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی

کہی ہیں لیکن نظم کی حیثیت ہی سے ان کا بلند درجہ ہے کیونکہ ایک ایسے دور میں وہ نظم کی طرف رجوع ہوئے تھے جب کہ مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ کا بول بالا تھا۔ غزل ہر خاص و عام میں مشہور تھی۔ نظم کا کوئی خاص تصور بھی نہیں تھا۔ زیادہ تر اصناف کے موضوعات مخصوص تھے۔ جیسے مثنوی میں منظوم داستانیں بیان کی جاتی تھیں۔ قصیدہ کی صنف مدح سرائی تک محدود تھی۔ مرثیہ شہدائے کربلا کے موضوع سے وابستہ تھا اور غزل کے مضامین کی اپنی ایک دنیا تھی۔ نظیر اکبرآبادی نے اپنے لیے ایک نئی دنیا آباد کی۔ یہ دنیا جسے ہم نظم کہتے ہیں۔ موضوعات اور ہیئت کے لحاظ سے بھی کسی روایت کی پابند نہ تھی۔ نظیر اکبرآبادی نے اس کی آزادیوں سے پوری طرح فائدہ اٹھایا۔

نظیر اکبرآبادی کی نظم میں فطری روانی پائی جاتی ہے۔ انسانی تجربات کا سیلاب سا امڈا چلا آتا ہے۔ ایک مضمون کو وہ سو طرح باندھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہ چیز ان کی نظم 'آدمی نامہ' میں بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ نظیر کی نظمیں عموماً طویل ہوتی ہیں۔ لیکن طویل ہونے کے باوجود ان کے اثر میں کہیں کمی واقع نہیں ہوتی۔ ہر بند میں ایسی کوئی نئی بات ضرور ہوتی ہے جو پڑھنے والے کی دلچسپی کو قائم رکھتی ہے۔ 'آدمی نامہ' بھی 16 بندوں پر مشتمل نظم ہے۔ نظیر نے اس نظم میں مخمس کی ہیئت استعمال کی ہے۔ آدمی ایک ہے لیکن اس کی فطرت کے ہزار رنگ ہیں۔ کسی ایک آدمی میں یہ سارے رنگ نہیں ہوتے بلکہ کسی میں کوئی رنگ، کسی میں کوئی رنگ ہوتا ہے۔ دنیا اسی لیے رنگا رنگ نظر آتی ہے کہ ہر آدمی اپنی ایک الگ فطرت، ایک الگ مزاج، ایک الگ خو بو، رکھتا ہے۔ کسی میں نیکی کا مادّہ زیادہ ہوتا ہے، کسی کی فطرت میں بدی ہی بدی ہوتی ہے۔ کوئی دلِ دردمند رکھتا ہے۔ کسی کا دل پتھر کا ہوتا ہے۔ کسی کے پاس دولت ہے تو اس کی کوئی حد نہیں ہے، کوئی غریب ہے تو بے حد غریب ہے۔ وفاداری بھی اس کی فطرت میں ہے اور بے وفائی بھی اس کا خاصہ ہے۔ گویا ہر شخص کو قدرت نے الگ الگ چیزوں اور نعمتوں سے نوازا ہے۔ قدرت کی طرف سے انسان کو عقل بھی ودیعت ہوئی ہے جس کے ذریعے وہ غور و خوض کر کے اپنے آپ کو نیک، سچا، ایماندار اور دوسروں کا خیر خواہ بنا سکتا ہے۔ نظیر نے اپنی نظم میں اچھے انسانوں کے ساتھ برے انسانوں کو بھی پیش کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا اسی کا نام ہے۔

7.3 نظیر اکبرآبادی کا تعارف

نظیر اکبرآبادی کا نام ولی محمد تھا۔ نظیر کی پیدائش ۱۷۴۰ء میں دہلی میں ہوئی، ان کے والد کا نام محمد فاروق تھا، والد کے انتقال کے بعد احمد شاہ ابدالی کے حملے وقت نظیر اپنی ماں اور نانی کو لے کر اکبرآباد (آگرہ) چلے آئے اور وہیں پر سکونت اختیار کی۔ نظیر کی شادی محمد رحمان کی لڑکی تہور بیگم سے ہوئی تھی جن سے ایک لڑکا خلیفہ گلزار علی اور ایک لڑکی امام بیگم تھیں۔

نظیر فارسی اور عربی سے بھی واقفیت رکھتے تھے اس کے ساتھ وہ فن خوش نویسی بھی جانتے تھے، جس کا اس زمانے میں بہت چرچا تھا، ان میں حد درجہ قناعت اور آسودگی تھی اسی لیے وہ نواب سعادت علی خان کے لکھنؤ طلب کرنے پر بھی نہیں گئے، اسی طرح سے انھوں نے بھرت پور کے راجا کی دعوت پر بھی جانے سے انکار کر دیا، اوائل عمر میں وہ متھرا گئے تھے اور وہیں پر کسی جگہ انھوں نے معلّمی کا پیشہ اختیار کر لیا، لیکن وہ وہاں پر ایک قلیل مدت ہی رہ سکے اور بہت جلد وہ واپس آگرہ آ گئے اور یہاں پر وہ لالہ بلاس رائے کے لڑکے کو سترہ روپیہ ماہانہ کے مشاہرہ پر پڑھانے لگے۔

شعر کہنا شروع کیا تو اپنا راستہ آپ نکالا، عید بقرعید، شب برات، کے ساتھ ساتھ ان کے لیے ہولی، دیوالی، راکھی اور

جنم اشٹمی ،اپنے تہوار تھے،ان سب تہوار کوانھوں نے اپنی شاعری میں بھی یادرکھا ہے۔غرض اس زمانے کی عوامی زندگی کا کوئی بھی پہلو ایسا نہ تھا جس سے نظیر بے تعلق رہے ہوں، ان کے پاس الفاظ کا غیر معمولی ذخیرہ تھا، وہ موقع اور موضوع کے اعتبار سے مناسب الفاظ کا استعمال کرتے ہیں،ان کے کلام میں تأثیر بہت ہے۔

7.4 نظم ''آدمی نامہ'' کی تشریح وتجزیہ

نظم کا پہلا بند ہے:

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی — اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار و بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی — نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اس بند میں نظیر نے جن دو متضاد رنگوں یا چیزوں کی طرف توجہ دلائی ہے وہ ہے آدمی کی حیثیت اور حالت۔ایک طرف کسی کو بادشاہ کا درجہ حاصل ہے،کوئی دولت مند ہے اور ساری نعمتیں اس کے دسترخوان پر میسر ہیں اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو غربت کے شکار ہیں اور جن کی گزر بسر روٹی کے سوکھے ٹکڑوں پر ہو رہی ہے، گویا امیری غریبی کا یہ فرق وہ ہے جو صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔نظیر غریبی کو مٹانے کا کوئی حل پیش نہیں کرتے لیکن دولت مندوں کو یہ احساس ضرور دلاتے ہیں کہ انھیں ان غریب اور مدد کے بھوکے انسانوں کی طرف بھی دیکھنا چاہیے۔

دوسرا بند ہے:

ابدال، قطب، غوث، ولی، آدمی ہوئے — منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے، کشف و کرامات کے لیے — حتّٰی کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جاملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اس بند میں نظیر نے خداترس ولیوں اور صوفیوں، سنتوں کے مقابل میں خدا سے انکار کرنے والی مخلوق کو رکھ کر یہ بتایا ہے کہ وہ بندگانِ خدا جو خدائے بزرگ و برتر کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔خدا نے انھیں زبردست روحانی علم وصلاحیت سے نوازا ہے۔اسی کا فیض ہے کہ ایک دن انھیں معرفت خداوندی نصیب ہو جاتا ہے۔جس سے وہ لوگ محروم رہتے ہیں جو خدا کے وجود ہی کے منکر ہیں۔نظیر کے نظر میں یہ ان کی بہت بڑی بدنصیبی ہے۔

تیسرا بند ہے:

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا — شدّاد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا — یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

جیسا کہ اس سے پہلے کے بند میں شاعر نے منکر لوگوں کا ذکر کیا تھا،لیکن ان کے بارے میں کچھ اور وضاحت نہیں کی تھی۔جیسا کہ عبادت گزار خداترس لوگوں کے بارے میں کہا تھا کہ انھیں معرفت خداوندی نصیب ہو جاتا ہے۔اوپر لکھے ہوئے بند

میں نظیر نے فرعون، شداد اور نمرود کا حوالہ دیا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو خدا کے منکر تھے اور خود کو خدا کہتے تھے۔ خدا نے انھیں اپنے بدانجام تک پہنچایا۔ فرعون، شداد اور نمرود کو نظیر نے تلمیح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ تلمیح ایک صنعت ہے، تلمیح تاریخی یا نیم تاریخی یا روایتی قصے، واقعے یا کسی ہستی پر مبنی ہوتی ہے۔

چوتھا بند ہے:

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور　　یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور　　شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی رہ نما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اس بند میں نظیر نے آدمی کے دو مختلف روپ اجاگر کیے ہیں۔ یہ روپ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ نظیر کے کلام میں 'تضاد' کی صنعت کو بڑی خوبی سے استعمال کیا گیا ہے۔ ایک شکل اثبات کے ساتھ وابستہ ہے۔ دوسری نفی کے ساتھ۔ جیسے آدمی نار ہے یعنی وہ آگ جس کا کام جلانا ہے اور وہ نور بھی ہے یعنی خدا خود نور ہے اور اس نور کا عکس انسان میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ 'وحدت الوجود' کا تصور ہے کہ سارے جلوے خدا کے جلوے ہیں۔ نظیر کہتے ہیں کہ یہی آدمی پاس بھی ہے یعنی یوں تو بہ ظاہر سب ایک دوسرے کے نزدیک ہیں لیکن پاس ہونے کے باوجود ان میں ایک دوسرے کے لیے اخلاص اور ہم دردی کا جذبہ نہیں ہے۔ اس لیے یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہ ظاہر ہی آس پاس ہیں اصل میں ان میں انسانی نیک جذبوں کے لحاظ سے بے حد دوری ہے۔ اسی خیال کی تفسیر باقی کے مصرعوں میں بیان کی گئی ہے کہ آدمی اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی کا مجموعہ ہے۔ وہی پیغمبر اور نیک راہ دکھانے والا ہے اور وہی مکاری اور زور زبردستی بھی کرتا ہے جو شیطنیت کی علامت ہے۔

پانچواں بند ہے:

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں، میاں　　بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں　　اور آدمی ہی اُن کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اس بند میں بھی دوسرے لفظوں میں وہی بات دہرائی گئی ہے جسے اس سے قبل کے بند میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی آدمی ہی خدا کا گھر بناتا ہے، قرآنِ مجید کی تلاوت کرتا ہے۔ نماز پڑھتا اور نماز پڑھاتا ہے اور وہی یہ نازیبا حرکت بھی کرتا ہے کہ مسجد میں آنے والے نمازیوں کی جوتیاں بھی چراتا ہے۔ نظیر کا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ موقعہ ملنے پر آدمی برا کام کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ اس کے دل سے خوفِ خدا بھی چلا جاتا ہے۔ اس میں سزا اور جزا کا احساس ہی مر جاتا ہے اسی لیے تو وہ اتنے برے کام کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔

چھٹا بند ہے:

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی　　اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اُتارے ہے آدمی　　چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سُن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اس بند میں بھی شاعر نے آدمی کو مجموعۂ اضداد بتایا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر جان بھی دیتا ہے اور موقعہ ملنے پر دوسرے کی جان لینے سے بھی باز نہیں آتا۔ وہی ایک دوسرے کو ذلیل بھی کرتا ہے اور ایک دوسرے کو مدد کے لیے پکارتا بھی ہے اور ایک دوسرے کی مدد بھی کرتا ہے یعنی آدمی اگر نیک ہے تو بدی بھی اس کی فطرت کا ایک حصہ ہے۔

ساتواں بند ہے:

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو، لے کے مال — اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال — سچا بھی آدمی ہی نکلتا ہے، میرے لال
اور جھوٹ کا بھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر اکبرآبادی نے اس بند میں بھی انسانوں کے اُن دونوں رُخوں کو پیش کیا ہے کہ بہت سوچ سمجھ کر کسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ چاہے وہ کوئی مسافر ہی کیوں نہ ہو۔ کب کوئی دھوکا دے کر محنت کی کمائی اڑا لے جائے نہیں کہا جا سکتا۔ اپنی غرض کے لیے آدمی دوسرے کے گلے میں موت کا پھندا بھی ڈال سکتا ہے۔ آدمی ہی کسی کو اپنے اعتماد کے جال میں پھنساتا ہے اور کبھی خود بھی کسی دوسرے کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ آدمی سچا بھی ہے اور جھوٹا بھی۔ گویا نظیر یہ باور کراتے ہیں کہ آدمی پر بہت سوچ سمجھ کر بھروسہ کرنا چاہیے۔ آدمی دوسرے کو پہلے اپنے اعتماد میں لیتا ہے پھر اس بھروسے کی آڑ میں بڑی آسانی کے ساتھ دھوکہ دے دیتا ہے۔ نظیر، ہمیں خبردار کرتے ہیں کہ فوراً کسی پر بھروسہ نہیں کر لینا چاہیے۔

آٹھواں بند ہے:

یاں آدمی ہی شاد ہے اور آدمی بیاہ — قاضی، وکیل آدمی اور آدمی گواہ
تاشے بجاتے آدمی چلتے ہیں، خوامخواہ — دوڑے ہیں آدمی ہی تو مشعل جلائے راہ
اور بیاہنے چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اس بند میں شاعر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آدمی ہی دولھا بنتا ہے، وہی قاضی، وکیل اور گواہ بنتا ہے۔ وہی شادی کی خوشی میں ناچتا گاتا ہے۔ وہی شادی کے جلوس (بارات) میں مشعلیں جلا کے چلتا ہے۔ اس بند کی ایک خاص بات یہ ہے کہ آدمی کا ایک ہی رخ نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کریہہ اور بدنما رخ کو سامنے نہیں لایا گیا ہے جو اوپر کے تمام بندوں میں مذکور ہے۔

نواں بند ہے:

یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار — اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقہ، صراحی، جوتیاں دوڑیں بغل میں مار — کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں دوڑتے کہار
اور اُس میں جو پڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

شاعر کہتا ہے کہ آدمی ہی خبردار کرتا ہے۔ وہی پیادہ ہے اور وہی سوار بھی ہے۔ وہی خدمت گزار بھی ہے۔ پالکی کاندھے پر اٹھا کے چلتا ہے۔ گویا ایک کے مقسوم میں آرام ہی آرام ہے اور دوسرے کی قسمت میں کسی اور کی خدمت اور غلامی ہے۔ یہاں زندگی کے اس تضاد کو نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے کہ برابری کہیں نہیں ہے۔ انسان، انسان ہی کی محنت کا استحصال کرنے والا ہے۔

دسواں بند ہے:

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا　　اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا
کہتا ہے کوئی 'لو' کوئی کہتا ہے 'لا رے لا'　　کس کس طرح کی بیچیں ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر نے اس بند میں بڑی بے تکلف زبان استعمال کی ہے کہ آدمی ہی خوانچے لگا کے طرح طرح کی چیزیں بیچتا ہے اور خریدار بھی آدمی ہی ہے۔ بازار میں چیزیں بیچنے والے جس طرح آوازیں لگاتے ہیں نظیر نے اسی طرح انھیں دُہرایا ہے۔ گویا آدمی کو اپنی کنبہ پروری کے لیے طرح طرح کے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ زندگی گزارنا اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔

گیارہواں بند ہے:

طبلے، مجیرے، دائرے، سارنگیاں بجا　　گاتے ہیں آدمی ہی ہر اک طرح جا بجا
رنڈی بھی آدمی ہی نچاتے ہیں گت لگا　　اور آدمی ہی ناچے ہیں اور دیکھ پھر مزا
جو ناچ دیکھتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

شاعر کہتا ہے کہ گانا گانے والا بھی آدمی ہے۔ دوسرے کو نچا کر دیکھنے اور لطف لینے والا بھی آدمی ہی ہے۔ یعنی ایک اپنی گزر بسر کے لیے ناچنے پر مجبور ہے تو دوسرے کے پاس روپے پیسے کی اتنی افراط ہے کہ وہ دوسرے کو نچا کر تفریح حاصل کرنا چاہتا ہے اور دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا اور لطف لینا ہی اس کا مقصد ہے۔

بارہواں بند ہے:

یاں آدمی ہی لعل و جواہر ہیں بے بہا　　اور آدمی ہی خاک سے بدتر ہے ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے کہ الٹا ہے جوں توا　　گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا ہے چاند کا
بدشکل، بدنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اس بند میں آدمی کے اس تضاد کو پیش کیا گیا ہے کہ آدمی ہی کچھ ایسے بڑے اور نیک کام کرتا ہے کہ وہ بیش قیمت معلوم ہوتا ہے اور وہی ایسے کام بھی کرتا ہے جنھیں اس کے دامن پر بدنما داغ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہاں نظیر نے آدمی کو سیاہ رو اور گورا بھی کہا ہے۔ وہ کالا اس لیے ہے کہ برے کام کرتا ہے اور گورا اس لیے ہے کہ نیک کام بھی وہی انجام دیتا ہے۔ نظیر نے بے حد سلیس اور سادہ لفظوں میں زندگی کا گہرا فلسفہ بیان کر دیا ہے۔

تیرہواں بند ہے:

اک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں　　روپے کے جن کے پاؤں ہیں سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں　　کم خواب، تاش، مشال دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یہاں بھی اس تضاد کو زبان دی گئی ہے کہ کسی کے پاس دولت ہے تو اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اسے ہر طرح کی نعمت اور آسائش میسر ہے اور وہی آدمی ہے جو اتنا سنگدل ہے کہ دوسرے کے غم کا اسے احساس نہیں ہے۔ یعنی دردمندی سے اس کا دل عاری ہے۔

چودھواں بند ہے:

حیراں ہوں یارو، دیکھو تو کیا یہ سوانگ ہے　　اور آدمی ہی چور ہے اور آپی تھانگ ہے
ہے چھینا جھپٹی اور کہیں بانگ تانگ ہے　　دیکھا تو آدمی ہی یہاں مثلِ رانگ ہے
فولاد سے گڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اس بند میں بھی آدمی کے متضاد رخوں کو بیان کیا گیا ہے۔ آدمی ہے چور ہے اور چور کو پناہ بھی وہی دیتا ہے۔ اصل میں وہ کیا ہے یہ سمجھنا مشکل ہے کیونکہ وہ تو سو سو طرح سے سوانگ بھرنے میں ماہر ہے۔ وہ بھیک بھی مانگتا ہے اور لوٹ مار کرنے کے لیے بھی تیار رہتا ہے۔ گویا آدمی ایک ہے اور اس کے چہرے انیک ہیں۔

پندرہواں بند ہے:

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار　　نہلا دُھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زار زار　　سب آدمی ہی کرتے ہیں مُردے کا کاروبار
اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اس بند میں بھی اُن ضدوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ مرنے والے کے حق میں کلمہ پڑھنے والے آنسو بہانے والے، نہلا دھُلا کے کاندھوں پر اٹھا کر لے جانے والے بھی انسان ہی ہیں اور انسان ہی ہے جو مرنے والے تک کو لوٹنے سے باز نہیں آتا۔ گویا اتنا خودغرض اور سنگدل ہے کہ وہ نیک کام بھی کرتا ہے تو دکھاوے کے لیے یا مجبوری کے باعث۔ ورنہ اسے موقعہ ملے تو مردوں کو بھی نوچ کھائے۔

سولہواں آخری بند ہے:

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر　　یہ آدمی ہی کرتے ہیں سب کارِ دلپذیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر　　اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

آدمی نامہ کا یہ آخری بند ہے جس میں نظیر اوپر کے تمام بندوں کا نچوڑ یہ کہہ کر پیش کر دیتے ہیں کہ تمام طرح کے بہترین کام انجام دینے والا بھی آدمی ہے اور برے سے برے کام بھی وہی انجام دیتا ہے۔ وہی شریف ہے اور وہی رذیل بھی۔ نظیر آدمی کو برا ضرور کہتے ہیں لیکن اس سے نفرت کا حق کسی کو نہیں دیتے۔ کیونکہ نظیر کی نظر میں انسان نیک بھی ہے بد بھی۔ اچھا بھی ہے برا بھی۔ وہ دردمند بھی ہے سنگدل بھی۔ گویا وہ اضداد کا مجموعہ ہے۔ نظیر انسان سے نہ تو مایوس ہیں اور نہ بیزار اور نہ اس سے شاکی اور نہ اسے تحقیر کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ طنز بھی کرتے ہیں تو اس میں کوئی شدت یا تلخی نہیں ہوتی۔ ہنسی ہنسی میں وہ بڑے پتے کی بات کر جاتے ہیں۔ آدمی نامہ میں بھی زندگی کے گہرے تجربوں کو زبان دے دی گئی ہے۔ سلیس اور سادہ زبان میں زندگی کا فلسفہ بیان کر دیا گیا ہے۔

7.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

(1) 'آدمی نامہ' میں شاعر نے کن بری عادتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(2) نظم 'آدمی نامہ' میں شاعر نے کن نیک انسانوں کا ذکر کیا ہے۔

(3) نظم 'آدمی نامہ' میں نظیر نے کن اچھی عادتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

7.6 فرہنگ

مدح سرائی	تعریف بیان کرنا	ہادی	ہدایت کرنے والا
مخمّس	پانچ مصرعوں پر مشتمل بند	رہ نما	راستہ دکھانے والا
خُو بُو	عادت، خصلت	اثبات	قبول کرنا
خیر خواہ	دوسروں کی بھلائی چاہنے والا	نفی	انکار کرنا
زردار	دولت مند	وحدت الوجود	یہ تصور کہ خدا ہر شئے میں موجود ہے
بے نوا	مفلس، فقیر	اخلاص	نیکی
متضاد	ایک دوسرے کی ضد	تفسیر	وضاحت
میسر ہونا	حاصل ہونا	علامت	اشارہ
ابدال	اولیا، اللہ کا گروہ	اضداد	ضد کی جمع
قطب	ولی، بزرگ	صید	شکار
غوث	مدد کرنا، فریاد	نقیب	بانسری، سردار
ولی	بزرگ ہستی	مقسوم	قسمت
منکر	خدا کو نہ ماننے والا	استحصال	لوٹ کھسوٹ
کرشمہ	معجزہ	زرق برق	چمک دمک
کشف	غیب کے راز کا ظاہر ہونا	فرق	سر کی مانگ
کرامات	کرامت (کی جمع) بزرگی، بڑائی	غرب	مغرب
زُہد	پرہیز گاری	شرق	مشرق
ریاضت	محنت مشقت کرنا	فولاد	لوہا
خالق	پیدا کرنے والا یعنی خدا	سوانگ	بہروپ
معرفت	عرفان حاصل ہونا	اشراف	اشرف کی (جمع) بزرگ، شریف

نار	آگ	کارِدلپذیر	دل پسند کام
قبح	بدنما	مرید	شاگرد
ظہور	ظاہر ہونا	پیر	بزرگ
مکر	مکاری	رذیل	کمینہ پن، نالایق
زور	طاقت	تحقیر	حقارت

فرعون : قدیم مصر کا ایک بادشاہ، جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ خدا ہے۔ موسیٰؑ خدا کے پیغمبر تھے۔ فرعون ان کے خلاف تھا۔ موسیٰؑ جب اپنی قوم کو لے کر دریائے نیل کے کنارے پہنچے تو پانی دو حصوں میں بٹ گیا اور دریا کے بیچ ایک راستہ بن گیا۔ جس سے موسیٰؑ اور ان کی قوم تو خیریت کے ساتھ گزر گئی۔ لیکن جب فرعون اور اس کی فوج نے وہی راہ اختیار کی تو پانی پھر یک جا ہو گیا اور وہ سب ڈوب گئے (یہ ایک تلمیح ہے۔ جو صنعت کہلاتی ہے۔ اس کے تحت بیان کردہ واقعہ یا ہستی تاریخی بھی ہو سکتی ہے اور غیر تاریخی بھی)

شدّاد : (یہ بھی ایک تلمیح ہے) شدّاد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قومِ عاد کا بادشاہ تھا۔ جسے اپنی حکومت اور طاقت کا بہت غرور تھا۔ اسے بھی خدائی کا دعویٰ تھا۔ اس نے ایک مصنوعی جنّت بنوائی تھی۔ اس کا انجام بھی بہت برا ہوا۔

نمرود : (یہ بھی ایک تلمیحی کردار ہے) اسے بھی خدائی کا دعویٰ تھا۔ اسے بھی اپنی طاقت پر بہت غرور تھا۔ اس نے حضرتِ ابراہیمؑ کو آگ میں ڈلوا دیا تھا۔ خدا کے حکم سے وہ آگ گلزار بن گئی تھی۔

7.7 معاون کتب

گلزارِ نظیر	مرتبہ: سلیم جعفری
ادب اور زندگی	مجنوں گورکھپوری
دیوانِ نظیر اکبر آبادی	مرتبہ: فرحت اللہ بیگ

اکائی 8 برکھارُت (حالؔی)

اکائی کے اہم اجزا

8.1 اغراض ومقاصد

8.2 تمہید

8.3 حالؔی کی سوانح

8.4 حالؔی کی شعری خصوصیات، مرتبہ اور اہمیت

8.5 برکھارت کی خصوصیات

8.6 متن: انتخاب ''برکھارُت''

8.7 برکھارت کا خلاصہ وتجزیہ

8.8 نمونہ برائے امتحانی سوالات

8.9 فرہنگ

8.10 معاون کتب

8.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں مولانا الطاف حسین حالؔی کی نظم ''برکھارُت'' کے متن اور مواد کا تعارف کروایا گیا ہے۔

اس اکائی کو پڑھ لینے کے بعد طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ:

☆ حالؔی کی زندگی کے حالات بیان کر سکیں

☆ حالؔی کی شعری خصوصیات کی وضاحت کر سکیں

☆ حالؔی کی نظم ''برکھارت'' کا خلاصہ کر سکیں۔

8.2 تمہید

اردو ادب میں حالی کو اس لیے اہمیت دی جاتی ہے کہ انہوں نے جس صنف کو بھی اپنایا اس میں جدت پیدا کر دی جوان سے پہلے کسی نے نہ کی۔ حالی کی یہ نظم ''برکھارُت'' مثنوی کی ہئیت میں کہی ہے۔ اس زمانے میں جب انجمن پنجاب کے مشاعرے ہوتے تھے، مثنوی کہنے کا رواج تھا۔ اس لیے حالی نے بھی اس نظم کو مثنوی کی ہئیت میں لکھا۔ مثنوی عموماً فوق فطری قصوں، کہانیوں اور داستانوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ لیکن حالی نے ''برکھارُت'' میں ایک بالکل ہی الگ موضوع کو لے کے مثنوی کا روپ دیا

ہے۔ چوں کہ یہ نظم عام روایتی مثنویوں کی ڈگر سے ہٹ کر ہے اور اس میں جدید نظم کی ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں اس لیے ہم نے اس کو نظم کے تحت رکھا جس کے بارے میں آپ اس اکائی میں جانیں گے۔

8.3 حالؔی کی سوانح

خواجہ الطاف حسین حالؔی کا خاندان ہرات سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے جد اعلیٰ خواجہ ملک علی خاں غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہندوستان آئے۔ وہ انصاریوں کے معزز خانوادے سے تھے۔ ان کا ننہیال سید تھا۔ خواجہ ملک علی خاں کو پانی پت کے نزدیک سوپی پت میں چند گاؤں جاگیر کے ملے تھے۔ حالؔی کے والد خواجہ ایزد بخش تھے۔ حالؔی کا جنم دلّی میں ہوا۔ حالؔی نو برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بڑے بھائی اور بہن نے تعلیم و تربیت دی۔ قرآن کریم حفظ کیا، فارسی اور عربی درسیات پڑھ ہی رہے تھے کہ سترہ برس کی عمر میں اُن کی مرضی کے خلاف شادی کردی گئی۔ تحصیل علم کے شوق میں 1854ء کو وہ بھاگ کر دہلی پہنچے اور مولوی نوازش علی سے عربی پڑھی۔ 1855ء میں اعزّہ کے اصرار پر پانی پت آگئے اور حصار میں ملازم ہوگئے۔ وہاں سے 1857ء کے ہنگامے کی وجہ سے واپس پانی پت چلے گئے جہاں چار پانچ برس خاموشی سے مطالعہ میں صرف کیے۔ کچھ عرصہ بعد نواب مصطفیٰ خاں شیفتؔہ کے یہاں ان کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوگئے جہاں ان کے شعری ذوق کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ اوّل اوّل شیفتؔہ کو اپنا کلام دکھاتے تھے، بعد میں مرزا غالبؔ سے تلمذ حاصل کیا۔ شیفتؔہ کے انتقال کے بعد گورنمنٹ بک ڈپو، لاہور میں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی انشاء درست کرنے پر ملازم ہوگئے۔ لاہور میں چار برس کی ملازمت کے دوران انھیں انگریزی ادب و شاعری کے جدید خیالات سے ایک خاص نسبت ہوگئی اور اردو شاعری کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ دہلی آنے پر وہ اینگلو عربک اسکول میں استاد مقرر ہوئے۔ سرسید کے مشورے سے 1879ء میں ''مسدّس حالؔی'' لکھی۔ علی گڑھ کالج کی امداد کے لیے بہت کام کیا۔ سرسید کی سفارش پر حیدرآباد کی حکومت نے وظیفہ مقرر کردیا۔ 1905ء میں وہ جب حیدرآباد گئے تو ان کے وظیفہ کی رقم میں اضافہ کردیا گیا۔ وہاں سے وہ پانی پت چلے گئے جہاں 1914ء میں ستر برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

حالؔی نہایت خلیق اور ملنسار تھے۔ سچے قومی جذبات ان کے دل میں تھے، چناں چہ نثر اور شاعری سے انھوں نے وہ کام لیا جس کی مثال اردو ادب میں ملنا مشکل ہے۔ 1904ء میں تعلیمی خدمات کے اعتراف نے حکومت ہند نے ان کو ''شمس العلماء'' کا خطاب بھی دیا تھا۔

8.4 حالؔی کی شعری خصوصیات۔ مرتبہ اور اہمیت

مولانا حالؔی کی ابتدائی شاعری روایتی انداز کی ہے۔ جب سرسید سے ملاقات ہوئی تو ان کے مشورے سے 1879ء میں انھوں نے ''مسدس'' لکھی۔ انجمن پنجاب سے وابستہ ہوئے تو کرنل ہالرائیڈ کے مشورے سے نظموں اور قومی و وطنی شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے انجمن کے مشاعروں میں نئے انداز کی مثنویاں پیش کیں۔ ان کا یہ انداز مقبول و مشہور ہوا اور وہ قومی شاعر کہلانے لگے۔ انھوں نے اپنی نظموں، مثنویوں اور شخصی مراثی سے وہ کام کیا کہ اپنی سوئی ہوئی قوم کو نہ صرف بیدار کیا بلکہ

شعروادب کی نئی راہ نکالی جس پر زمانہ آج تک گامزن ہے۔

حالؔی نے نثر میں بھی تاریخی کارنامے انجام دیے۔انھوں نے 1874ء میں ''مجالس النساء'' کے نام سے ناول لکھا۔ حیات سعدی، حیات جاوید، یادگار غالبؔ جیسی یادگار سوانح لکھ کر اردو کو سوانح نگاری کی نئی صنف سے روشناس کرایا اور ''مقدمہ شعروشاعری'' لکھ کر نئے طرز کی تنقید کی ابتدا کی۔

حالؔی نے شاعری میں مرثیہ، مثنوی اور نظم نگاری کا مزاج تبدیل کیا اور شاعری کو اصلاحِ قوم اور بیداری کے ساتھ وطن دوستی کو پروان چڑھانے کے لیے استعمال کر کے نئی راہ ہموار کی۔

حالؔی نے انجمن پنجاب لاہور کے زیر اہتمام چار مثنویاں لکھیں۔ برکھا رُت، نشاط امید، حب وطن اور مناظرہ رحم و انصاف۔ یہ ساری مثنویاں اب نظمیں کہلاتی ہیں۔انجمن کا پہلا مشاعرہ 1874ء میں منعقد ہوا اور حالؔی جب سے ہی اس میں شریک رہے۔

مولانا الطاف حسین حالؔی کا مرتبہ اردو ادب میں نہایت ممتاز ہے۔انھوں نے سب سے پہلے غزل اور قصیدہ میں نیا رنگ اختیار کیا۔سیاسی، قومی اور اسلامی نظمیں لکھیں۔قدیم طرز کے تکلف وتصنع اور خلاف واقعہ باتوں کو ترک کیا۔مولانا حالؔی کے کلام میں نیچر کی پیروی، مبالغہ اور اغراق سے انحراف، زبان وخیالات میں سادگی، پُراثر جذبات کا اظہار، صنائع و بدائع کا کم کم استعمال وغیرہ نے ان کو جدید شاعری کا امام بنا دیا۔اگلے صفحات میں ان کی مشہور طویل نظم برکھا رُت پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

8.5 برکھا رُت کی خصوصیات

حالؔی نے پہلی بار برکھارت کے ذریعہ نظم کو ایک ارتقائی وسیلہ کے عمل سے روشناس کیا۔ان کی اس طویل نظم میں تمہید، موضوع پر اظہارِ خیال، نقطہ عروج اور انجام اس طرح سامنے آئے ہیں کہ نظم میں تازگی پیدا ہوگئی اور یہ سننے والوں اور پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

''برکھا رُت'' کی زبان فارسی وعربی الفاظ سے بوجھل نہیں ہے۔اس میں سنسکرت، ہندی اور برج بھاشا کے الفاظ کا مناسب استعمال ہے۔حالؔی نے اردو لغت میں نہ صرف نئے الفاظ کا اضافہ کیا بلکہ یہ بھی سکھایا کہ دوسری زبانوں سے استفادے کی کیا صورت حال ہونی چاہیے۔

حالؔی نے اپنی نظموں کو مبالغہ سے پاک رکھا۔حقیقت پسندی، پاک فطری جذبات اور احساست اس طرح پیش کیے کہ وہ آنے والے زمانوں اور شعرا کے لیے مشعل راہ بن گئے۔

8.6 متن: انتخاب ''برکھا رُت''

گرمی کی تپش بجھانے والی — سردی کا پیام لانے والی
قدرت کے عجائبات کی کان — عارف کے لیے کتابِ عرفان

وہ شاخ و درخت کی جوانی
وہ مور و ملخ کی زندگانی

وہ سارے برس کی جان برسات
وہ کون؟ خدا کی شان برسات

آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد
اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاں دار
اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار

تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں
اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں

تھے شیر پڑے کچھار میں سست
گھڑیال تھے رود بار میں سست

ڈھوروں کا ہوا تھا حال پتلا
بیلوں نے دیا تھا ڈال کندھا

آرے تھے بدن پہ لو کے چلتے
شعلے تھے زمین سے نکلتے

تھی آگ کا دے رہی ہوا کام
تھا آگ کا نام مفت بدنام

بچوں کا ہوا تھا حال بے حال
کمھلائے ہوئے تھے پھول سے گال

آنکھوں میں تھا ان کی پیاس سے دم
تھے پانی کو دیکھ کرتے مم مم

ہر بار پکارتے تھے ماں کو
ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو

پانی دیا گر کسی نے لاکر
پھر چھوڑتے تھے نہ منہ لگا کر

بچے ہی ، نہ پیاس سے تھے مضطر
تھا حال بڑوں کا اُن سے بدتر

کل شام تلک تو تھے یہی طور
پر رات سے ہی سماں ہے کچھ اور

پُروا کی دہائی پھر رہی ہے
پچھوا سے خدائی پھر رہی ہے

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
اک شور ہے آسماں پہ برپا

ہے ابر کی فوج آگے آگے
اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے

ہیں رنگ برنگ کے رسالے
گورے ہیں کہیں، کہیں ہیں کالے

ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی
اک آتی ہے فوج، ایک جاتی

جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے
ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے

توپوں کی ہے جب کہ باڑھ چلتی
چھاتی ہے زمین کی دہلتی

مینھ کا ہے زمین پر دریڑا
گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا

بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی
آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
جنت کی ہوائیں آرہی ہیں

ابر آیا ہے ، گھر کے آسمان پر
کلمے ہیں خوشی کے ہر زبان پر

مسجد میں ہے وردِ اہل تقویٰ
یا ربّ لنا ولا علینا

مندر میں ہے ہر کوئی یہ کہتا
کرپا ہوئی تیری میگھ راجا!

کرتے ہیں گرو، گرو گرنتھی
گاتے ہیں بھجن کبیر پنتھی

جاتا ہے کوئی ملھار گاتا
ہے دیس میں کوئی گنگناتا

رکھشک جو بڑے ہیں جین مت کے
ڈھکنے ہیں دلوں پہ رکھتے پھرتے

کرتے ہیں وہ یوں جیون کی رکھشا
تاجل نہ اُٹھے کوئی پتنگا

ہے شکر گزار تیرے برسات!
انسان سے لے کے تا جمادات

دنیا میں بہت تھی چاہ تیری
سب دیکھ رہے تھے راہ تیری

تجھ سے ہے کُھلا یہ رازِ قدرت
راحت ملتی ہے بعدِ کلفت

گلشن کو دیا جمال تو نے
کھیتی کو کیا نہال تو نے

دریاؤں میں تو نے ڈال دی جان
اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان

جن باغوں میں اڑتے تھے بگولے
واں سیکڑوں اب پڑے ہیں جھولے

تھے ریت کے جس زمیں پہ انبار
ہے بیر بہوٹیوں سے گلنار

کھم باغوں میں جا بہ جا گرے ہیں
جھولے ہیں کہ سو بہ سو پڑے ہیں

کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن
جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن

جب گیت ہیں ساری مل کے گاتی
جنگلوں کو ہیں سر پہ وہ اُٹھاتی

ہے ان میں کوئی ملھار گاتی
اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی

گاتی ہے کوئی، کبھی ہنڈولا
کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا

اک جھولے سے وہ گری ہے جا کر
سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر

بیزار اک اپنے جان و تن سے
بچھڑا ہوا صحبتِ وطن سے

غم خوار ہے کوئی اور نہ دل جو
اک باغ میں ہے پڑا لبِ جو

ابر اتنے میں اک طرف سے اُٹھا
اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا

برق آ کے لگی تڑپنے پیہم
اور پڑنے لگی پھوار کم کم

آنے جو لگے ہوا کے جھونکے
تھے جتنے سفر کے رنج بھولے

وہ آپ ہی آپ گنگنانا
اور جوش میں آ کبھی یہ گانا

اے چشمۂ آبِ زندگانی
گھٹیو نہ کبھی تری روانی

جاتی ہے جدھر تری سواری
بستی ہے اُسی طرف ہماری

پائے جو کہیں مری سبھا کو
دیتا ہوں میں بیچ میں خدا کو

اول کہیو! سلام میرا
پھر دیجیو یہ پیام میرا

قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا
فرقت میں تمہاری آئی برکھا

پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد! جی میں جب بھری ہو دیس کی یاد
نشتر کی طرح تھی دل میں چبھتی فریاد یہ درد ناک اس کی
تھا سوز میں کچھ ملا ہوا ساز پکڑا دل، سن اس کی آواز
حیرت رہی دیر تک کہ آخر روڑا ہے کہاں کا یہ مسافر
پھر غور سے اک نظر جو ڈالی
نکلا وہ ہمارا دوست حالؔی

8.7 برکھارُت کا خلاصہ و تجزیہ

مولانا حالؔی نے لاہور قیام کے دوران ہالرائیڈ کے ایما پر انجمن پنجاب کے ذریعہ منعقدہ مشاعروں میں جدید انداز کی چار مثنویاں پڑھیں۔ اس میں سب سے پہلے انجمن کے اوّلین جلسہ میں 1874ء کو برکھارُت پڑھی گئی۔ مولانا محمد حسین آزاؔد جو انجمن پنجاب کے روح رواں تھے، انھوں نے بہت ستائش کی اور یہ نظم جدید طرز کا خشت اوّل ٹھہری۔

برکھارُت میں 145 اشعار ہیں۔ اس میں حالؔی نے اوّل اوّل تمہید کے بطور پر برسات کی اہمیت نمایاں کی ہے۔ تمہید کے بعد برسات کی مختلف کیفیات، رسموں کا ذکر، اس موسم میں ہندوستان کے مذہبی، نیم مذہبی، سوشل اور سماجی روایات کا ذکر، میلے اور تقریبات کا بیان، برسات سے قبل گرمی کے حالات، اس کی پریشانی، انسان، جانور اور پیڑ پودوں پر اس کے اثرات، زمین و آسمان کی تپش غرض تمام جمادات و نباتات پژمردہ ہیں۔ حالؔی نے گرمی کے ان اثرات کا حقیقی نقشہ نظم کیا ہے۔ اور ایک ایک بات کو خوبی سے بیان کیا ہے۔ برسات کے موسم میں جانوروں اور پرندوں کی مستی و بیخودی، درختوں کی سرسبزی اور شادابی اور ان سب کا اثر انسانی فطرت اور جذبات پر کس طرح پڑتا ہے اس کی سچی تصویریں بنائی ہیں۔

کسانوں کی مسرت، لڑکیوں کا جھولا جھولنا اور پردیسیوں کو وطن واپسی کی یاد غرض ان سب کا ''برکھارت'' میں والہانہ بیان ہے اور کسی بھی جگہ صداقت اور حقیقت مبالغے اور جھوٹ کا شکار نہیں ہوئی۔ اس نظم میں روزمرّہ کے معمولات، منظر نگاری اور واقعہ نگاری کے بیان میں حالؔی نے کمال دکھایا ہے۔ تمہید کے بعد گرمی اور پیاس کی تکلیف بتاتے ہوئے بچوں کا ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

بچوں کا ہوا تھا حال بے حال کمھلائے ہوئے تھے پھول سے گال
آنکھوں میں تھا ان کی پیاس سے دم تھے پانی کو دیکھ کرتے مم مم
ہر بار پکارتے تھے ماں کو ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو
پانی دیا گر کسی نے لاکر پھر چھوڑتے تھے نہ منہ لگا کر

اسی کے بعد گھن گھور گھٹاؤں کی آمد سے برسات ہونے کا امکان، ماحول میں تازگی اور برسات کے بعد اس موقع پر غم کے بعد خوشی آنے پر دیکھیے کیا کہتے ہیں ؎

ہیں شکر گزار تیرے برسات انسان سے لے کر تا جمادات

دنیا میں بہت تھی چاہ تیری　　سب دیکھ رہے تھے راہ تیری
تجھ سے کھلا یہ راز قدرت　　راحت ملتی ہے بعد کلفت

برکھارت کے چار حصے ہیں۔ ہر حصے میں علاحدہ علاحدہ کیفیات کا بیان ہے۔ آخری حصے میں ایک پردیسی کو وطن کی یاد آتی ہے۔ واضح رہے کہ مولانا حالؔی خود اس وقت لاہور میں تھے اور انھیں وطن کی یاد ستا رہی تھی۔

غم خوار ہے اور نہ کوئی دلجو　　اک باغ میں پڑا ہے لب جو
ابر اتنے میں اک طرف سے اُٹھا　　اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا
ساماں کیے جو دل لگی کے　　یاد آتے مزے کبھی کبھی کے
پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد　　جب جی میں بھری ہو آپس کی یاد

وطن کی یاد کو بڑے جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔ مثنوی میں جا بجا انسانی جذبات کی سچی عکاسی موجود ہے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے گنگنانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ بارش کی بوند بوند چہل پہل میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ مولانا حالؔی کہتے ہیں انسان کی قسمت کا لکھا برکھارت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ تمام مصیبتیں رنج و غم برسات کی بوندوں سے دُھل گئے۔

''برکھارُت'' میں حالؔی نے سادہ اور عام الفاظ استعمال کیے ہیں جس میں عربی فارسی کی جگہ ہندی اور مقامی لفظیات کی کثرت دکھائی دیتی ہے۔ نظم کا عنوان بھی عربی و فارسی کے بجائے مقامی ہے۔ اس میں حالؔی نے برسات اور اس سے متعلق الفاظ کا ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ بارش کے بعد ندی نالوں کی کیفیت، موسم میں پیدا ہونے والے کیڑوں کا ذکر مختلف طبقات کی مصروفیت، باغوں میں جھولے، ملہارا، تیراکی، بگلوں کی قطار، مرغابیوں کا فضا میں اُڑنا، ندی کے پاٹ، موجوں کی روانی، مچھلیوں کے منجدھار سے مقابلے اور ناؤ کے ڈگمگانے کا منظر پیش کر کے برکھارت کی خوبصورتی، روانی اور حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔

خود جانچنے کے سوال

۱۔ حالؔی کے جد اعلیٰ ہندوستان کہاں سے آئے؟
۲۔ حالؔی کس سن میں پیدا ہوئے؟
۳۔ ''مسدس'' حالؔی نے کس کے مشورے سے لکھی؟
۴۔ انجمن پنجاب لاہور کے روح رواں کون تھے؟
۵۔ حالؔی نے انجمن پنجاب کے مشاعرے میں کتنی مثنویاں پیش کیں؟
۶۔ ''برکھارُت'' میں اشعار کی تعداد کتنی ہے؟
۷۔ ''برکھارُت'' کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے؟

8.8 نمونہ برائے امتحانی سوالات

۱۔ مولانا حالؔی کے سوانحی حالات بیان کیجیے۔

۲۔ حالؔی کے کلام کی خصوصیات بیان کیجیے۔
۳۔ ''برکھارُت'' کی ادبی اہمیت پر نوٹ لکھیے۔
۴۔ ''برکھارُت'' کی منظر نگاری پر نوٹ لکھیں۔
۵۔ ''برکھارُت'' میں ارتقائی عمل کی وضاحت کیجیے۔

8.9 فرہنگ

عارف : خدارسیدہ بزرگ
تازیانہ : کوڑا
خلقت : خلق کی جمع۔عوام
مراق : پاگل پن
تخصیص: خصوصیت۔انفرادیت
پچھوا : پچھّم کی طرف سے چلنے والی ہوا
یقوئی : پرہیزگاری۔پارسائی
کلفت : صدمہ۔رنج۔تکلیف
رُت : موسم
چشمہ : جھرنا
طاؤس : مور
مخفی : پوشیدہ۔چھپا ہوا

کہسار : پہاڑ
افلاک : فلک کی جمع۔آسمان
خفقان : دیوانگی۔وحشت
العطش : پیاس۔تشنگی
پروا : پورب سے آنے والی ہوا
چرخ : آسمان
جمادات: جماد کی جمع۔بے جان چیزیں جیسے لوہا۔پہاڑ
میگھ : بارش
برق : بجلی
چکلے : چوڑے
دگرگوں : خراب

8.10 معاون کتب

۱۔ محمد اسماعیل پانی پتی : تذکرۂ حالؔی
۲۔ وحید قریشی : مطالعۂ حالؔی
۳۔ صالحہ عابد حسین : یادگارِ حالؔی
۴۔ انوار الحسن : مولانا حالؔی
۵۔ سید محمد فاروق : حیات حالؔی
۶۔ غلام مصطفیٰ خاں : حالؔی کا ذہنی ارتقاء
۷۔ عبادت بریلوی : جدید شاعری

اکائی 9 ''تعلیمِ نسواں'' (اکبرؔ الہ آبادی)

اکائی کے اہم اجزا

9.1 اغراض ومقاصد

9.2 تمہید

9.3 اکبرؔ الہ آبادی کا تعارف

9.4 اکبرؔ کی شعری خصوصیات

9.5 متن: تعلیم نسواں

9.6 نظم ''تعلیم نسواں'' کا خلاصہ

9.7 ''تعلیم نسواں'' کا اسلوب بیاں

9.8 نمونہ برائے امتحانی سوالات

9.9 فرہنگ

9.10 معاون کتب

9.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے ذریعے طلبہ اردو نظم کی جامع تعریف، صنف کی خصوصیات آغاز وارتقا اور اکبرؔ الہ آبادی کی نظم گوئی اور ان کے ظریفانہ کلام کی خصوصیات سے بخوبی واقف ہوسکیں گے۔

اس اکائی کو پڑھ لینے کے بعد طلبہ اس قابل ہوجائیں گے کہ وہ:

☆ اکبرالہ آبادی کی زندگی کے حالات بیان کرسکیں

☆ اکبرالہ آبادی کی شعری خصوصیات کی وضاحت کرسکیں

☆ نظم ''تعلیم نسواں'' کا خلاصہ اور تجزیہ کرسکیں۔

9.2 تمہید

اکبرالہ آبادی اردو کے مشہور طنزیہ شاعر ہیں۔ انہوں نے پہلی بار انگریزی الفاظ کو اردو شاعری میں استعمال کرکے ایک نیا تجربہ ایجاد کیا جس کی تقلید آج بھی جاری ہے۔ اس اکائی میں ہم ان کی زندگی کے حالات اور ان کی شعری خصوصیات کے بارے میں واقفیت حاصل کریں گے۔ اس کے علاوہ ان کی مشہور نظم ''تعلیم نسواں'' کا متن، خلاصہ اور تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

9.3 اکبرالہ آبادی کا تعارف

اردو کی ظریفانہ شعری تاریخ میں اکبرالہ آبادی کا نام امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ان کا پورا نام سید اکبر حسین اور تخلص اکبر تھا۔ ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو الہ آباد کے ایک قصبے بارہ میں پیدا ہوئے ان کے والد تفضّل حسین رضوی عرف چھوٹے میاں کے نام سے مشہور تھے اور تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے۔

انھوں نے ابتدائی تعلیم کے درجات میں ہمیشہ امتیازی حیثیت حاصل کی۔ ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۰ء میں ہائی کوٹ میں مسل خوانی کی جگہ ملی۔ ۱۸۷۲ء میں وکالت کی ڈگری حاصل کی اور ۱۸۸۰ء تک وکالت کرتے رہے اور ترقی کر کے ۱۸۸۴ء میں عدالت خفیہ کے جج کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۹۰۳ء میں سرکاری عہدے سے سبکدوش ہو کر شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ اکبر نے ۹ دسمبر ۱۹۲۱ء کو الہ آباد میں پچھتر سال کی عمر میں وفات پائی۔

اکبر ابتدا ہی سے شوخ طبع اور بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔اوائل عمر ہی سے انھیں شعر و ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ابتدا میں اکبر نے غلام حیدر جو آتش کے شاگرد تھے شاعری میں اصلاح لی۔اور اپنا ایک الگ رنگ اختیار کیا۔جس سے ان کے ذوق شعری اور تخیلی پرواز میں جلا پیدا ہوتی گئی۔اکبر کی شہرت ظرافت آمیز اشعار پر مبنی ہے۔انھوں نے اگرچہ اردو شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن طنز و ظرافت کو اپنی شاعری کا مستقل موضوع بنایا۔وہ مشرقیت کے دلدادہ اور مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید کے سخت خلاف تھے۔

9.4 اکبر کی شعری خصوصیات

اس دور کے شعرا میں سیدھے سادے مضامین عام فہم لفظوں کے ذریعے شعری پیکر میں ڈھالنے کا رواج عام تھا۔ابتدا میں اکبر نے اسی نوع کی شاعری کی لیکن اکبر کے اس دور کے کلام کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اکبر کی شہرت اور مقبولیت کو اس وقت عروج حاصل ہوا جب انھوں نے قدیم روایات اور طرز فکر سے ہٹ کر جدید طرز اختیار کی اور طنز و مزاح کو مستقل طور پر اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔اور مستقل طور پر طنز و ظرافت کے میدان ہی میں طبع آزمائی کی اور اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے عوام پر انگریزوں کے ظلم و استبداد کا سلسلہ جاری تھا اور ہندوستانیوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔نتیجہ کے طور پر مغربی تہذیب و روایات کا تسلط بڑھا جا رہا تھا۔قوم کی اس تباہ کن حالت کو دیکھ کر اکبر کو گہرا صدمہ پہنچا۔انھوں نے اپنا پیغام براہِ راست نہ دے کر طنز و مزاح اور ظرافت کے پیرائے میں عوام و خواص تک پہنچایا۔وہ ہمیشہ مغرب کی کورانہ تقلید اور اس کی پیروی کے مخالف رہے اور انگریزوں کے سفّاکارانہ رویوں کے خلاف اپنی تخلیقات پیش کرتے رہے۔اپنے طنزیہ اشعار اور نظموں کے ذریعے اہلِ مشرق کو یہ پیغام دیتے رہے کہ اہلِ مغرب کی روایات اور طور طریقوں کو ہرگز قابلِ قبول تصور نہیں کیا جائے۔

اکبر دور اندیش اور بذلہ سنج واقع ہوئے تھے ان کی بذلہ سنج طبیعت نے ظرافت کے رنگا رنگ پھول کھلائے۔ انھوں نے نظم کے علاوہ شاعری کی دیگر اصناف مثلاً غزل، رباعی اور قطع وغیرہ میں طبع آزمائی کی۔ان کی غزلوں میں جدید و قدیم

دونوں طرح کے رنگوں کا امتزاج موجود ہے۔خوش طبعی اور ظرافت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ان کی طنز وظرافت میں کوئی نہ کوئی مقصدیت اور نصیحت ضرور پنہاں ہوتی تھی۔

اکبر کے کلام میں مستعمل الفاظ بظاہر بہت ہلکے اور بے معنی لگتے ہیں۔لیکن ان لفظوں کی گہرائی میں بڑی معنویت اور مقصدیت چھپی ہوتی ہے۔مثلاً بدھو، جمن، شیخ ٹیٹو، ریل گاڑی، وغیرہ جیسے الفاظ اکبر نے علامت کے طور پر استعمال کئے ہیں۔

اکبر کے یہاں انگریزی لفظیات کا استعمال بھی ملتا ہے۔ان لفظوں کو علامت بنا کر انھوں نے مغربی تہذیب وتمدن کی بے حیائی اور بے شرمی کا مضحکہ اڑایا ہے۔ ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کو مشرقی تہذیب اور یہاں کی مہذب روایات پر عمل پیرا ہونے کا مشورہ دیا ہے۔

اکبر کو عموماً ایک طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا رہا لیکن ان کی شعری عظمت صرف ظریفانہ شاعری تک محدود نہیں۔اگر اکبر کی ظریفانہ شاعری کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو وہ ملک وقوم کے افراد کے لئے یہ ایک ایسا اصلاحی پیغام ہے جس کو پڑھ کر قوم کی ناگفتبہ حالت پر قہقہوں کے بجائے آبدیدہ ہونا پڑتا ہے۔

اکبر نے اپنی قومی نظموں اور مزاحیہ کلام کے ذریعے اپنی ایک الگ شناخت بنائی۔ان کی شاعری نے دراصل مشرقیت اور مغربی تضاد سے جنم لیا وہ مغرب کی چمک دمک کے خلاف تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں اور خصوصاً عورتوں کو اپنے مذہب اور مشرقی تہذیب وروایات کی حدود میں رہ کر اعلیٰ تعلیم اور ممتاز عہدوں پر فائز دیکھنا چاہتے تھے۔ان کی ظریفانہ شاعری انگریزوں کی ذہنی غلامی سے بالاتر ملتِ اسلامیہ کے لئے ایک شاندار مستقبل کی بشارت ہے۔ان کے طنز میں شائستگی اور مزاح میں لطافت ہوتی ہے۔اسی پہلو کے ذریعے اکبر نے اردو شاعری میں نئے امکانات تلاش کئے ہیں۔

مشرقی تہذیب کا تحفظ اکبر کا نصب العین تھا وہ کبھی مذہب کے خلاف نہیں رہے اور ہمیشہ مذہب کی اہمیت کے قائل رہے۔بے پردگی اور آزادئ نسواں کا ذکر ان کی ظریفانہ شاعری میں جابجا اصلاح کے طور پر ملتا ہے۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں — اکبر زمیں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پُوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہُوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

لفظ ومعنی پر ید طولیٰ ہونے کی وجہ سے اکبر کے کلام میں فطری سادگی، روانی، سلاست اور بے ساختہ پن پیدا ہو گیا ہے۔ اکبر نے مذاق اور مضحکہ میں تہذیب وشائستگی اور سنجیدگی کا بہت خیال رکھا ہے۔

اکبر کے یہاں طنز، ظرافت آمیز اور خالص ظرافت تینوں پہلوؤں کے الگ الگ نمونے ملتے ہیں۔تمسخر اور استہزا میں ایک مخصوص قسم کی شائستگی اور لطافت پائی جاتی ہے۔ظرافت پیدا کرنے میں انھوں نے سب سے زیادہ الفاظ کا سہارا لیا ہے۔اور لفظوں کے الٹ پھیر سے کلام میں ظرافت پیدا کی ہے۔رعایتِ لفظی سے اکبر نے بڑے حسین اور پر معنی مضامین ہیدا کئے ہیں۔ وہ فطری زندگی اور روزمرّہ کے معاملات سے ہنسنے اور مسکرانے کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتے ہیں۔ان کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں سماجی تہذیب اور تعلیمی اصلاح کے بے شمار گوشے پوشیدہ ہیں۔قافیے کے استعمال پر بھی انھیں بڑی قدرت حاصل بھی جس کو پڑھ کر قارئین کے دلوں میں گدگدی پیدا ہو جاتی ہے۔سنجیدگی اور متانت اکبر کے کلام کی ظریفانہ خوبی ہے۔اس نوع کا واعظانہ اور ناصحانہ طنز اردو شاعری میں کسی دوسرے شاعر کے یہاں موجود نہیں۔

9.5 متن: تعلیمِ نسواں

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے
حسنِ معاشرت میں سراسر فتور ہے
اور اس میں والدین کا بے شک قصور ہے
ان پر یہ فرض ہے کہ کریں کوئی بند و بست
چھوڑیں نہ لڑکیوں کو جہالت میں شاد و مست
لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت
جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت
آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت
ہو وہ طریق جس میں ہو نیکی و مصلحت
ہر چند ہو علومِ ضروری ہے عالمہ
شوہر کی ہو مرید تو بچّوں کی خادمہ
مذہب کے جو اصول ہوں اس کو بتائے جائیں
باقاعدہ طریق پرستش سکھائے جائیں
اوہام جو غلط ہوں وہ دل سے مٹائے جائیں
سِکّے خدا کے نام کے دل میں بٹھائے جائیں
عصیاں سے محترز ہو خدا سے ڈرا کرے
اور حسنِ عاقبت کی ہمیشہ دعا کرے
تعلیم خوب ہو تو نہ آئے گی دام میں
خالق سے لو لگائے گی وہ اپنے کام میں
اس کو سکھایا جائے یہ واضح کلام میں
اچھا برا جو کچھ ہے خدا ہی کے ہاتھ ہے
نیکی اگر کرے گی جو فطرت بھی ساتھ ہے
تعلیم ہے حساب کی بھی واجبات سے
دیوار پر نشان تو ہیں واہیات سے
یہ کیا زیادہ گن نہ سکے پانچ سات سے
لازم ہے کام لے وہ قلم اور دوات سے

گھر کا حساب سیکھ لے خود آپ جو ڑنا
اچھا نہیں ہے غیر پہ یہ کام چھوڑنا
کھانا پکانا جب نہیں آیا تو کیا مزا
جوہر ہے عورتوں کے لیے یہ بہت بڑا
لندن کے بھی رسالوں میں میں نے یہی پڑھا
مطبخ سے رکھنا چاہیے لیڈی کا سلسلہ
وقت آ پڑے تو گاڑھے گزی میں بھی عذر کیا
گھر کے لئے طعام پزی میں بھی عذر کیا
سِینا پِرونا عورتوں کا خاص ہے ہنر
درزی کی چوریوں سے حفاظت پہ ہو نظر
عورت کے دل میں شوق ہے اس بات کا اگر
کپڑوں سے بچّے جاتے ہیں گل کی طرح سنور
کسبِ معاش کو بھی یہ فن ہے کبھی مفید
اس شغل سے ہے دل کے بہلنے کی بھی امید
سب سے زیادہ فکر ہے صحّت کی لازمی
صحّت نہیں درست تو بے کار زندگی
کھانے بھی بے ضرر ہوں صفا ہو لباس بھی
آفت ہی ہو جو گھر کی صفائی میں کچھ کمی
تعلیم کی طرف ابھی اک دو قدم بڑھیں
صحّت کے حفظ کے جو قواعد ہیں وہ پڑھیں
پبلک میں کیا ضرور کہ جا کر تنی رہے
تقلید مغربی پہ عبث کیوں ٹھنی رہے
داتا نے دھن دیا ہے تو دل سے غنی رہے
پڑھ لکھ کے اپنے گھر میں ہی دیوی بنی رہے
مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز ورقص کا اسکول اور ہے
دنیا میں لذتیں ہیں نمائش ہے شان ہے
ان کی طلب میں حرص میں سارا جہان ہے

اکبر سے یہ سُنو کہ جو اس کا بیان ہے
دنیا کی زندگی فقط اک امتحان ہے
حد سے جو بڑھ گیا تو ہے اُس کا عمل خراب
آج اس کا خوشنما ہے مگر ہوگا کل خراب

9.6 ''تعلیم نسواں'' کا خلاصہ

لسان العصر اکبر الہ آبادی کی نظم 'تعلیمِ نسواں' ایسے دور میں تخلیق کی گئی جب ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط تھا اور ملک کے عوام مغربی تہذیب کی چکاچوند میں ڈوبے ہوئے تھے اور مشرقی تعلیم اور معاشرے سے بیزار ہوتے جا رہے تھے۔ ایسے دور میں اکبر نے مسلمانوں اور خصوصاً عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا اور انھیں مشرقی تعلیم کی طرف مائل بھی کیا۔

اس دور کے تقاضوں کے پیشِ نظر اکبر الہ آبادی نے 'تعلیمِ نسواں' کے عنوان سے ایک نظم قلم بند کی اس نظم کے ذریعے شاعر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے۔ اور ان کی تربیت میں والدین بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ والدین کے لیے لازمی ہے کہ وہ مشرقی طرز پر لڑکیوں کی خانگی تربیت کریں یعنی گھر اور سماج میں رہنے کے آداب، شوہر کی خدمت، بچوں کی پرورش، دینی تعلیم، مکر و فریب اور گناہوں سے دور رہنے کی ترغیب دی جائے۔ خوفِ خدا، تقویٰ، پرہزگاری، خالق کائنات میں یقین کامل، نیکی اور بدی میں فرق، گھریلو حساب کتاب، کھانا بنانا اور سینا پرونا عورتوں کی خانگی زندگی کا اہم حصّہ ہیں۔ شاعر نے عورت کو سماج کی ایک مثالی خاتون بننے کے لیے مزید چند باتوں کی جانب اشارہ کیا ہے یعنی عورت کو اپنے شوہر اور بچوں کی صحت کا خیال رکھنا، نفیس لباس یعنی خوش لباسی کا شوق، تزکیہ نفس، ایثار و قناعت اور ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنے کا جذبہ وغیرہ۔

نامحرم اور عوامی زندگی سے پرہیز اور مغربی رقص و سرور سے گریز کرتے ہوئے مشرقی طور طریقوں میں ڈھل کر گھر کی چہار دیواری میں ایک باعزت اور پاکیزہ زندگی گذارنے کا بھرپور لطف اٹھانا۔ اکبر کے نزدیک یہی تعلیمِ نسواں کا اصل مقصد ہے۔ اکبر الہ آبادی اس نظم کے ذریعے یہ پیغام 'Message' دینا چاہتے ہیں کہ دنیا ایک سرائے فانی ہے اس کی ظاہری چمک دمک فانی اور عارضی ہے۔ دنیا ایک امتحان گاہ کے مانند ہے جو لوگ ظاہری اور بناوٹی دنیا کی چمک، چکاچوند اور عیش و طرب میں ڈوبے ہوئے ہیں اگر وہ دنیا کی ہوس میں حد سے تجاوز کریں گے اور بے عمل ہو جائیں گے۔ لیکن ان کی یہ خوشنما اور آسودہ حال زندگی عارضی اور بے معنی ہے۔ ان کا مستقبل تاریک اور عاقبت یقیناً خراب ہوگی۔

9.7 ''تعلیم نسواں'' کی زبان و اسلوب

اس نظم کی زبان اور اسلوب نہایت ہی بامعنی پرمغز اور بیانیہ ہے۔ اکبر نے تعلیم نسواں کے ذریعے اپنے افکار و نظریات کو بڑے عام فہم اور سادہ سلیس انداز میں بیان کیا ہے۔ مزاحیہ طرز فکر اور ظریفانہ بیان کی وجہ سے بھی یہ نظم منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

شاعر نے لفظیات، محاوروں اور روزمرّہ کا استعمال موقع محل برجستہ اور شعری ضرورتوں کے مطابق کیا ہے۔

نظم کا طرزِ تخلیق اگر چہ اس دور کی زبان اور لفظیات کے تقاضوں اور مستعمل اصطلاحات کے مطابق ہے اور اکبر نے اسی منفرد رنگ کو شعری اصطلاحات میں برتنے کی شعی کی ہے۔ بایں ہمہ اس کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ آج کے دور کی زبان اور مستعمل لفظیات سے مملو ہے۔ اکبر نے اپنی فنکارانہ چابکدستی سے نظم کے اسلوب میں ایک مخصوص قسم کی نغمگی، لطافت اور درس کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ جو تعلیمِ نسواں اور خواتین کے لئے مختص ہے۔

تعلیم نسواں کے موضوع پر ظریفانہ انداز میں اصلاحی شاعری کا تصور صرف اکبر الہ آبادی کی اختراع ہے۔

9.8 نمونہ برائے امتحانی سوالات

۱۔ اکبر الہ آبادی کے ظریفانہ کلام کی خصوصیات بیان کیجیے۔

۲۔ نظم تعلیم نسواں کا خلاصہ اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

۳۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت میں والدین کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟

۴۔ اس نظم میں شاعر نے تعلیم یافتہ خواتین کی کن کن خوبیوں کو اجاگر کیا ہے؟

۵۔ نظم 'تعلیمِ نسواں' سے خواتین اور سماج کو کیا پیغام (Messege) ملتا ہے؟

9.9 فرہنگ

حسنِ معاشرت	سماج میں اچھی زندگی گزارنے کا فن	مطبخ	باورچی خانہ، کچن
بےشعور	بےسلیقہ	طعام	کھانا
معاشرت	خوش اسلوب سے مل جل کر زندگی گذارنا	عذر	بہانہ
فتور	خرابی	کسب معاش	بسر اوقات کا طریقہ
بندوبست	انتظام	مفید	فائدے مند
شاع ومست	خوش وخرم	شغل	مشغلہ
تمکنت	غرور، تکبّر	حفظ	زبانی یاد کرنا
عالمہ	علالم کی تانیث، علم جاننے والی عورت	تقلید	پیروی کرنا
طرق پرستش	عبادت کا صحیح طریقہ	عبث	بےکار
اوہام	وہم کی جمع	خوشنما	خوبصورت نظر آنے والا
عصیاں	گناہ	واجبات	ضروری چیزیں
محترز	پرہیز کرنا		

9.10 معاون کتب

۱۔ کلیاتِ اکبرالہ آبادی

۲۔ اصنافِ ادب اردو

۳۔ اردو ادب کی تاریخ

اکائی 10 شعاعِ امید (اقبال)

اکائی کے اہم اجزا

10.1 اغراض ومقاصد

10.2 تمہید

10.3 شاعر کا تعارف

10.4 نظم ''شعاعِ امید'' کا تعارف

10.5 متن: ''شعاعِ امید''

10.6 نظم ''شعاعِ امید'' کی تشریح

10.7 نمونہ برائے امتحانی سوالات

10.8 فرہنگ

10.9 معاون کتب

10.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ

☆ علامہ اقبال کی نظم نگاری کی خصوصیات بیان کرسکیں گے۔

☆ نظم شعاع امید کی تشریح کرسکیں گے اور اس میں موجود فکری وفنی کمال کا نمونہ پیش کرسکیں گے۔

10.2 تمہید

اس اکائی میں ہمیں علامہ اقبال کی نظم شعاع امید کے مطالعے کا موقع ملے گا جس کے ذریعہ ہم ان کی ہم وطنی کا نمونہ پیش کرسکتے ہیں۔ اقبال کا مخصوص تمثیلی انداز جس میں سورج کا شعاعوں سے تخاطب اپنے آپ میں فکری اور فنی کمال کا عمدہ نمونہ ہے۔

10.3 شاعر کا تعارف

علامہ اقبال ۹ رنومبر ۱۸۷۷ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے، والد محترم کا نام شیخ نور محمد تھا اور ماں کا نام امام بی بی تھا، اقبال کے بزرگ سپرو برہمن تھے اور کشمیران کا وطن تھا، قبول اسلام کے بعد ان کا خاندان ترک وطن کر کے سیالکوٹ میں آباد ہو گیا تھا۔

اقبال کی عمر چار سال چار مہینے ہوگئی تو دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انھیں مکتب میں بٹھا دیا گیا، شیخ نور محمد کے ایک

دوست جو کہ شاہ صاحب کہلاتے تھے اور جن کا نام سید میر حسن تھا، انھوں نے مشورہ دیا کہ اقبال کی تعلیم صرف درس قرآن تک ہی محدود نہ ہونی چاہیے تو یہ کام انھوں نے شاہ صاحب کو ہی سونپ دیا۔ اور وہ اردو، فارسی اور عربی ادب کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ آٹھ نو برس کی عمر میں اقبال اسکاچ مشن اسکول میں داخل کیے گئے۔ شاہ صاحب بھی اس اسکول سے وابستہ ہو گئے تھے ان کو یہاں پر بھی ان کی رہنمائی حاصل رہی اور ان کی صحبت میں اقبال میں شعری ذوق پیدا ہو گیا۔ انھوں نے ۱۸۹۱ء میں مڈل اور ۱۸۹۳ء میں امتیاز کے ساتھ میٹرک پاس کیا یہیں سے انھوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی پاس کیا، اس کے بعد بی، اے کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے انھوں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ بی، اے کرنے کے بعد انھوں نے اسی کالج سے فلسفے سے ایم، اے کیا تعلیم کے دوران ان کو فلسفے کے پروفیسر آرنلڈ سے فیض یاب ہونے کا موقع بھی ملا۔

اقبال نے کم عمری یعنی میٹرک کرنے سے پہلے ہی روایتی انداز کی شاعری شروع کر دی تھی انھوں نے داغ دہلوی کی باقاعدہ شاگردی اختیار کی مگر جلد ہی نئے انداز کی شاعری کی طرف مائل ہوئے، انجمن حمایت اسلام کے بڑے بڑے جلسوں میں نظمیں پڑھنے لگے تو ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے۔ ۱۹۰۸ء میں واپس آئے تو وہ بالکل ہی بدلے ہوئے تھے اب ان کی شاعری قوم وملت کی فلاح و بہبود کے لئے وقف تھی۔

علامہ اقبال نے اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج میں ملازمت کی، اس کے بعد انھوں نے وکالت شروع کر دی، وکالت میں وہ بہت کامیاب نہیں ہوئے، حکومت برطانیہ نے ۱۹۲۳ء میں ان کو سر کا خطاب دیا۔

اقبال اپنے عہد کے بلند پایا شاعر نثر نگار اور ایک بڑے مفکر تھے، اقبال کا پہلا مجموعہ کلام: بانگ درا: ۱۹۲۴ء میں شایع ہوا، ابتدائی دور کی شاعری میں انھوں نے زیادہ تر وطنی نظمیں لکھی ہیں اور بعض نظموں میں انسان اور فطرت کا تقابل کرتے ہوئے انسان کی حقیقت کو جاننے کی اور انسانی زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

اقبال نے اپنے تصور خودی کے وسیلے سے فرد کی شخصیت کی تعمیر کے لیے ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کا پیغام دیا ہے، اقبال ایک نہایت ہی بلند پایا مفکر اور شاعر تھے، انھوں نے اپنی بلند پایا نظموں کے ذریعہ اردو شاعری کی وقعت میں اضافہ کیا ہے۔ فارسی میں انھوں نے: اسرار خودی: رموز بے خودی؛ اور جاوید نامہ جیسے عظیم شعری کارنامے انجام دیے ہیں۔

فارسی شاعری میں ان کے اور مجموعے: پیام مشرق: اور: زبور عجم: وغیرہ بھی ہیں، بانگ درا: ضرب کلیم: بال جبرئیل اور ارمغان حجاز ان کے اردو مجموعے کلام ہین، اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے انسانوں کو قوم، نسل، ملک، زبان وغیرہ کے امتیازات سے بلند ہو کر ساری نوع انسانی کی فلاح و بہبود کو اپنا نصب العین بنانے کی تلقین کی ہے۔

۱۰ر جنوری ۱۹۳۴ء کو اقبال کو نزلہ ہوا، جو کہ انفلوئنزا میں تبدیل ہو گیا، پھر ان کی آواز بیٹھ گئی، دل کا عارضہ بھی ہو گیا۔ مرض بڑھتے ہی گئے، صحت خراب ہو گئی، آخر کار ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو جب سورج طلوع ہو رہا تھا تب اردو شاعری کا یہ آفتاب غروب ہو چکا تھا، لاہور کی شاہی مسجد میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

10.4 نظم ''شعاعِ امید'' کا تعارف

نظم 'شعاعِ امید' اقبال کے تیسرے اردو شعری مجموعے 'ضرب کلیم' میں شامل ہے۔ یہ نظم تین بندوں پر مشتمل ہے جس

میں اقبال نے بیسویں صدی کے اس پس منظر کو ابھارا ہے جہاں ایک طرف مشرقی اقوام بطور خاص ہندوستانی اپنی کاہلی، بے عملی اور تقدیر پرستی کے سبب تاریکی میں گم ہیں تو وہیں دوسری جانب مغرب مادیت کی اندھی دوڑ اور مشینوں کی حکومت سے نڈھال ہے۔ یہی سبب ہے کہ اقبالؔ مغرب و مشرق دونوں کی حالت پر رنجیدہ بلکہ بڑی حد تک مایوس نظر آتے ہیں۔ اسی مایوسی بھرے پس منظر میں ن۔م کا پہلا بند شروع ہوتا ہے۔ یہاں اقبال کا مخصوص تمثیلی انداز جس میں سورج کا شعاعوں سے تخاطب اپنے آپ میں فکری و فنی کمال کا عمدہ نمونہ ہے۔ نظم کے پہلے اور دوسرے بند میں فضا مایوس کن ہے جس میں اقبالؔ اپنے ہم وطنوں کی پستی و بدحالی سے اس قدر رنجیدہ ہیں کہ مایوسی کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے مگر تیسرے بند میں اقبالؔ کے مخصوص رجائی انداز سے فضا تبدیل ہو جاتی ہے جس میں حب الوطنی کا جذبہ شدید ہونے کے باوجود اقبالؔ کا عالمی وطنیت کا نظریہ بھی چھپ پاتا۔ اقبال جہاں ایک طرف ہند کی تاریک فضا کو روشن کیے بغیر نہ چھوڑنے کے پختہ ارادے کا اظہار کر کے وطن پرستی کا دم بھرتے نظر آتے ہیں:

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

تو وہیں دوسری جانب اپنے بین الاقوامی نظریے کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

نظم 'شعاعِ امید' میں اقبال جہاں مشرق سے شدید محبت کا اظہار کر کے اپنے وطن سے محبت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں وہیں مشرق و مغرب کی سرحدوں کو بھی ایک کر دیتے ہیں۔

10.5 متن: ''شعاعِ امید''

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز کبھی صبح کبھی شام
مدّت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہری ایام
نے ریت کے ذرّوں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام
پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

(۲)

آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک چور ہے، مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذتِ نظارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش
پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے
اے مہرِ جہاں تاب! نہ کر ہم کو فراموش

(۳)

اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہ حور
آرام سے فارغ، صفتِ جوہرِ سیماب

بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبالؔ کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

چشمِ مہ و پروین ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ درِ ناب

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص و معانی
جن کے لیے ہر بحر پرآشوب ہے پایاب

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب

بت خانے کے دروازے پر سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ اب

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ شب کو سحر کر!

10.6 نظم ''شعاعِ امید'' کی تشریح

اقبال کی شاعری کا ایک خاص وصف خطابیہ اور تمثیلی انداز ہے جس میں وہ مخصوص صفات کی بنا پر پرندوں، مخصوص تاریخی اور مذہبی شخصیات یا قدرتی مناظر چاند، سورج، ستارے، لالہ گل وغیرہ کو اپنے پیغام کا ذریعہ بنا کر اس میں خاص تاثر اور کشش پیدا کر دیتے ہیں۔

نظم کا پہلا بند ان ہی خصوصیات کا حامل ہے جس میں فضا پر چھائی ہوئی مایوسی بیسویں صدی کے اس ہندوستان میں لے جاتی ہے جہاں ۱۸۵۷ء کی ناکم جنگِ عظیم کے نتیجے میں ملی۔ بدحالی اور ۱۹۱۴ء کی عالمی جنگ جس نے مایوسی کے ساتھ ایک انتشار بھی پیدا کر دیا تھا۔ اسی پس منظر میں نظم کا پہلا تمہیدی بند جس میں سورج کا اپنی شعاعوں سے والہانہ تخاطب اپنے آپ میں فنکارانہ کمال کا نمونہ ہے۔ سورج کا کام دنیا میں روشنی پھیلانا ہے، شعاعوں کا کام بھی کائنات کو پرنور کرنا ہے مگر نظم کے اس بند میں جو منظر ابھرتا ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ شعاعیں اپنے مقصد یعنی دنیا سے تاریکی رفع کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ لہٰذا سورج اس صورتِ حال سے مایوس ہو کر ان سے مخاطب ہوتا ہے کہ تمہاری تمام تر کوششوں کے باوجود دنیا کی تاریکی کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ شعاعوں کا ہر عمل رائیگاں ہو چکا ہے۔ نہ تو ان کی تجلی دنیا کو روشن کر پا رہی ہے اور نہ ان کا طواف دنیا کے چمن کو شاد و آباد ہی کر پا رہا ہے۔ اس عمل سے مایوس ہو کر سورج اپنی شعاعوں سے مایوسی بھرے لہجے میں واپس لوٹ آنے کو کہتا ہے۔ اقبال کے مزاج کے برخلاف اس بند کی پوری فضا مایوس کن اور ناامیدی کا مظہر ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ اقبال اس پہلے اور دوسرے بند کے ذریعہ اپنی بات کہنے کے لیے ماحول تیار کر رہے ہیں۔ اقبال کا مقصود دراصل ہندوستانی قوم کو بیدار کرنا ہے جس میں انھوں نے سورج اور شعاعوں کے ذریعے خطاب کیا ہے جو اقبال کا مخصوص اسلوب و انداز ہے۔

نظم کا دوسرا بند بھی اسی مایوسی بھری فضا کا مظہر ہے۔ پہلے بند میں جس طرح سورج شعاعوں سے مخاطب ہے وہ انھیں اپنے مقصد میں ناکام پا کر واپس لوٹ آنے کے لیے کہتا ہے۔ دوسرے بند میں شعاعیں بھی اس بات سے رنجیدہ ہیں کہ جس کام کے لیے وہ سورج سے بچھڑ گئی تھیں وہ اس میں ناکام ہیں۔ اس ناکامی کے لیے جہاں اقبال ایک طرف مغرب کی حد سے بڑھی ہوئی مادیت پرستی اور مشینوں کی حکومت سے روحانی ترقی کے در بند ہونے پر رنجیدہ ہیں۔ مغرب کے مقابلے میں

اقبال مشرقی اقدار کے دلدادہ تھے مگر آج مشرق میں جو خامیاں در آئیں ان میں کاہلی، سستی، بے عملی اور تقدیر پرستی نے اس کی جدو جہد اور جوش وخروش کو ختم کر ایک سکوت طاری کر دیا ہے جس کی وجہ سے دین و دنیا دونوں جوش و ولولے سے خالی ہوگئی ہیں۔ مشرق و مغرب کی ان ہی کمزوریوں سے مایوس ہوکر شعاعیں اپنی کم مائیگی کے احساس میں مبتلا واپس سورج کے سینے میں چھپ جانے کو بے تاب نظر آتی ہیں۔

دراصل ان دونوں بندوں میں اقبال نے تیسرے بند جو اس نظم کا مرکز بھی ہے اور مقصود بھی کے لیے پس منظر تیار کیا ہے۔ ان دو بندوں کو نظم کی تمہید بھی کہہ سکتے ہیں۔ تیسرے بند میں اچانک فضا تبدیل ہو جاتی ہے جہاں اقبال کا مخصوص رجائی رنگ ابھر کر آتا ہے۔ اس مایوس کن فضا میں انھیں شعاوں کے درمیان اچانک ایک شوخ کرن مختلف انداز میں مخصوص صفات کے ساتھ نمودار ہوتی ہے۔ جس کی نگاہوں کی شوخی حور کی مانند ہے تو طبیعت سیماب پا ہے۔ یہیں سے نظم میں ایک نئی فضا بکھرنے لگتی ہے۔

دراصل اس شوخ کرن کے پیرائے میں شاعر اقبال کی روح نظر آتی ہے اور سورج کے پیغام میں اقبال کا پیغام۔ اقبال کی مشرق سے شدید محبت مشرق کے ہر ذرّے کو جہاں تاب کرنے اور بطور خاص ہند کی تاریک فضا کو پرنور کرنے کے پختہ ارادے میں اقبال کی حب الوطنی کا جذبہ بہ بام عرش پر نظر آتا ہے۔ وہ جس طرح مغرب کے برخلاف مشرقی قدروں کے دلدادہ تھے۔ ہند کی اس تاریخ کو یاد کر کے فخر کرتے ہیں، چشم مہ و پروین جس خاک سے روشن تھیں، جس خاک نے غواص و معانی پیدا کیے آج اسی ہند کی حالتِ زار سے رنجیدہ اور مغموم ہیں۔ نظم کے اس بند میں اقبال نے ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کی تقدیر پرستی، بے عملی اور سستی کو ان کی بدحالی کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اقبال کا مشرق سے محبت کا شدید جذبہ اپنے آپ میں فخریہ ہونے کے ساتھ عالمی وطنیت کا وسیع نظریہ قابلِ ذکر ہی نہیں بلکہ قابلِ قدر بھی ہے جس میں مشرق و مغرب دونوں کی تاریکی دور کرنے کا پختہ اور مخلصانہ ارادہ انہیں ہندوستان سے محبت کے ساتھ عالمی وطنیت کا پیروکار ثابت کرتا ہے۔

خود جانچنے کے سوال

۱۔ سورج نے شعاعوں کو کیا پیغام دیا؟

۲۔ سورج نے شعاعوں سے اپنے تجلی کدہ دل میں سمانے کو کیوں کہا؟

۳۔ شوخ کرن کی خصوصیات بیان کیجیے۔

۴۔ چشم مہ و پروین کس خاک سے روشن تھیں؟

۵۔ بت خانے کے دروازے پہ کون سوتا ہے؟

۶۔ اقبال فطرت کے کس اشارے کی بات کرتے ہیں؟

۷۔ شعر مکمل کیجیے۔

i) چھوڑوں گی نہ میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ii) تقدیر کو روتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

10.7 نمونہ برائے امتحانی سوالات

۱۔ نظم ''شعاعِ امید'' کے حوالے سے اقبال کا نظریۂ وطنیت کی وضاحت کیجیے۔

۲۔ سورج مشرق و مغرب کے کن حالات سے رنجیدہ ہے؟

۳۔ مندرجہ ذیل اشعار کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو — جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز — اقبالؔ کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

10.8 فرہنگ

پہنائے فضا : فضا کی وسعت — بے مہری ایام : زمانے کی ناموافقت
طوف : اردگرد چکر لگانا — تجلّی کدہ : جلوہ گاہ
سیہ پوش : سیاہ لباس — جوہر : ہنر
عالمِ لاہوت : تصوف میں وہ مقام جہاں سالک فنا فی اللہ کا مقام حاصل کر لیتا ہے
سیماب : پارہ — مردانِ گراں خواب: گہری نیند سونے والے
حذف ریزہ : ٹھیکری — غواص و معانی : حقیقت کی تہ تک پہنچنے والے عالم
درِ ناب : سچا موتی — بیگانۂ مضراب : مراد خاموش
حذر : پرہیز — مہر : سورج
لذتِ نظارہ : دیکھنے کا مزہ — خاور : سورج

10.9 معاون کتب

کلیات اقبال — اقبال
اقبال۔شاعر و مفکر — نورالحسن نقوی
اقبال ماورائے دیر و حرم — پروفیسر سلیمان اطہر جاوید
افکار اقبال — محمد عبدالسلام خان
فکر اقبال — خلیفہ عبدالحکیم

اکائی 11 خاکِ ہند (چکبستؔ لکھنوی)

اکائی کے اہم اجزا

11.1 اغراض ومقاصد

11.2 تمہید

11.3 چکبستؔ لکھنوی: حیات اور شعری خدمات

11.4 نظم ''خاکِ ہند'' کا مرکزی خیال

11.5 متن: نظم ''خاکِ ہند''

11.6 نظم ''خاکِ ہند'' کی تشریح

11.7 ''خاکِ ہند'' کا عمومی جائزہ

11.8 خلاصہ

11.9 نمونہ برائے امتحانی سوالات

11.10 فرہنگ

11.11 معاون کتب

11.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے پڑھنے کے بعد طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ:

- ☆ چکبستؔ لکھنوی کی زندگی اور ان کی شعری خدمات کا تعارف کرائیں۔
- ☆ چکبستؔ لکھنوی کی نظم ''خاک ہند'' کا مرکزی خیال واضح کریں۔
- ☆ چکبستؔ لکھنوی کی نظم ''خاک ہند'' کی تشریح کریں۔
- ☆ چکبستؔ لکھنوی کی نظم ''خاکِ ہند'' کا عمومی جائزہ لیں۔

11.2 تمہید

آپ اردو کی مشہور اور مقبول صنف سخن ''نظم'' سے واقف ہیں۔ اردو میں نظم نگاری کا باضابطہ آغاز نظیرؔ اکبرآبادی سے ہوتا ہے۔ نظیرؔ کے بعد محمد حسین آزادؔ اور الطاف حسین حالیؔ، اسماعیلؔ میرٹھی، چکبستؔ لکھنوی، سرورؔ جہان آبادی، اقبالؔ، جوشؔ اور دیگر شعرا نے اردو نظم نگاری کو بہت فروغ دیا ہے۔ اس اکائی میں ہم اردو کے ایک اہم نظم نگار شاعر چکبستؔ لکھنوی کا تعارف کرائیں گے

اوران کی نظم ''خاکِ ہند'' کے مرکزی خیال سے بھی واقف کرائیں گے۔اس کے علاوہ اس نظم کی تشریح بھی پیش کی جائے گی اور ساتھ ہی اس نظم کا عمومی جائزہ بھی لیا جائے گا۔

11.3 چکبستؔ لکھنوی، حیات اور شعری خدمات

برج نرائن نام، چکبستؔ تخلص، ۱۸۸۲ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔چکبستؔ کے والد پٹنہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور وہ یہیں مقیم ہو گئے تھے۔چکبستؔ کی پرورش ان کے ماموں کے گھر ہوئی جو لکھنؤ میں رہتے تھے۔چکبستؔ کی اردو فارسی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ لکھنؤ کے ایک کالج میں بی اے کرنے کے بعد چکبستؔ نے الہ آباد یونیورسٹی سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ان کے خاندان کا تعلق کشمیر سے تھا لہٰذا انھوں نے اپنے ہم وطنوں کی فلاح اور اصلاح کے لیے ۱۹۰۳ء میں ''کشمیری ینگ منز ایسوسی ایشن'' کے نام سے ایک کلب قائم کیا تھا اور اسی اصلاحی مقصد کے تحت ایک رسالہ 'صبح' ۱۹۱۸ء میں جاری کیا تھا۔۱۲ر فروری ۱۹۲۶ء کو بریلی میں وفات پائی۔

چکبستؔ لکھنوی ایک فطری شاعر تھے۔ان کا ذہن ابتدا ہی سے شاعری کی طرف مائل تھا۔اس زمانے میں لکھنؤ کی فضا پر میر انیسؔ کی شاعری کا گہرا اثر تھا۔چکبستؔ بھی میر انیسؔ کے اسلوبِ شاعری سے متاثر ہوئے اور اکثر و بیشتر ان کے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی۔اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔

چکبستؔ لکھنوی محبِّ وطن انسان تھے اور انھوں نے حب الوطنی کے جذبے کے تحت قومی نظمیں لکھی ہیں۔ان نظموں میں انھوں نے ہندوستان کے غافل لوگوں کو بیدار کیا ہے اور دلوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے اپنے عہد کے سیاسی و سماجی خیالات کو اپنی شاعری میں جگہ دی اور اردو نظم کو قومی شعور کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔چکبستؔ نے بزرگوں اور قومی رہنماؤں کے مرثیے بھی لکھے ہیں اور ان کی سیرت کی عمدہ عکاسی کی ہے۔

چکبستؔ لکھنوی کی نظموں میں سادگی، سلاست، روانی اور ایک مترنم فضا ملتی ہے۔یہ نظمیں دردمندی کی وجہ سے نہایت پُر اثر ہیں۔

11.4 نظم ''خاک ہند'' کا مرکزی خیال

چکبستؔ لکھنوی کی تمام تر نظمیں وطن پرستی، اخوت اور قومیت کے جذبے کو ابھارتی ہیں۔ان کی نظموں نے ہندوستانیوں کے اندر وطنیت کا احساس جگایا اور قومیت کا شعور پیدا کیا ہے۔چکبستؔ لکھنوی نے ''خاکِ ہند'' میں وطن کے لوگوں کو وطن کی عظمت کا احساس دلایا ہے۔انھوں نے اپنے وطن کے ماضی کو یاد کیا ہے اور وطن کے بزرگوں کا ذکر بھی کیا ہے۔اپنے وطن کی ان خوبیوں کا ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے ہمارا ملک دنیا کے دیگر ملکوں میں ممتاز ہے۔چکبستؔ ہندوستان کی خاک پر فخر کرتے ہیں کہ گرچہ آج ہمارا ملک ہندوستان بے یار و مددگار ہے اور عوام بے بس ہیں لیکن ہمارے تابناک ماضی کا اثر باقی ہے۔یہ خاک وطن ہماری عظمت رفتہ کی یادگار ہے۔کشمیر اب بھی جنت نشاں ہے اور دریائے گنگا ہنوز رواں دواں ہے۔لہٰذا ہمیں مایوس اور ناامید نہیں

ہونا چاہیے۔ چکبستؔ کی خواہش ہے کہ موت کے بعد بھی خاک وطن کا کفن ملے جسے وہ اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ شاعر کا خیال ہے کہ اگر ہم ہندوستانی خواب سے بیدار ہو جائیں اور ہمارے دل و دماغ میں وطن کی محبت سما جائے تو ہمارے ملک ہندوستان کو پھر ماضی جیسی عظمت مل سکتی ہے جس پر ہم آج بھی فخر کرتے ہیں۔ اس نظم کا مرکزی خیال یہی ہے کہ غلام ہندوستان کو آزاد کرانے اور اسے شاندار ماضی کی عظمت دوبارہ عطا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستانی خواب سے بیدار ہو کر وطن کی محبت کو اپنا نصب العین بنالیں۔

خود جانچنے کا سوال

ذیل کے سوال کا جواب تیس (۳۰) سطروں میں لکھیے۔

(۱) چکبستؔ لکھنوی کی نظم نگاری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے ان کی نظم ''خاک ہند'' کے مرکزی خیال کی نشاندہی کیجیے۔

11.5 متن: نظم ''خاک ہند''

اَے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے — دریائے فیضِ قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حُسنِ ازل عیاں ہے — اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عزّ و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری — چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری — چشم و چراغِ عالم تھی سر زمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یُوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اِس معبدِ کہن کو — سرمدؔ نے اِس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ اُلفت بخشا اِس انجمن کو — سینچا لہو سے اپنے رانا نے اِس چمن کو
سب سُورمیرا پنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں، یا اُن کی ہڈّیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہے — اپنی رگوں میں اب تک اُن کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے — فردوسِ گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے
کشمیر سے عیاں ہے جنّت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اگلی سی تازگی ہے، پھُولوں میں اور پھلوں میں　　کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں　　پستی سی آ گئی ہے پر دل کے حوصلوں میں
گُل شمعِ انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حُبِّ وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم زماں ہمارا　　دُنیا سے مِٹ رہا ہے نام و نِشاں ہمارا
کُچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا　　اک لاشِ بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا
عِلم و کمال و ایماں ، برباد ہو رہے ہیں
عیش وطرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صورِ حُبِّ قومی اِس خواب سے جگا دے　　بھُولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سُنا دے
مُردہ طبیعتوں کی افسردگی مِٹا دے　　اُٹھتے ہوئے شرارے اِس راکھ سے دکھا دے
حُبِّ وطن سمائے ، آنکھوں میں نور ہو کر
سَر میں خمار ہو کر ، دل میں سُرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک　　رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سُخن مُبارک
بُلبُل کو گل مُبارک ، گُل کو چمن مُبارک　　ہم بیکسوں کو اپنا ، پیارا وطن مُبارک
غنچے ہمارے دِل کے اِس باغ میں کھلیں گے
اِس خاک سے اُٹھے ہیں، اِس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا　　آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اِس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرّہ اِس منزلِ کُہن کا　　تُلتا ہے برگِ گُل سے کانٹا بھی اِس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

11.6 نظم ''خاک ہند'' کی تشریح

چکبستؔ لکھنوی نے اس نظم میں ہندوستان کی عظمت اور اس کے شاندار ماضی کا بیان کرتے ہوئے اپنے زمانے کے ہندوستان کی بے کسی اور بے بسی پر اپنے افسوس کا اظہار کیا ہے۔

پہلا بند : اس بند میں چکبستؔ لکھنوی نے خاک ہند کی عظمت کی نشانیوں کا ذکر کیا ہے۔ شاعر کے مطابق یہاں بہنے والے دریا قدرت کا عطیہ ہیں۔ ہمالیہ کی بلند چوٹی جہاں پر صبح سورج کی پہلی کرن نمودار ہوتی ہے وہ ہندوستان کی سربلندی، عزت اور شان کی علامت ہے۔

دوسرا بند: شاعر کہتا ہے کہ چین اور عرب جو علوم وفنون کے مرکز تسلیم کیے جاتے تھے ان کا سرچشمہ ہندوستان ہی تھا۔ یونان جو کبھی

فلسفہ اور دانش کا گہوارہ بنا اس سے قبل ہی ہندوستان میں ادب کی شمع روشن ہوئی تھی۔

تیسرا بند: شاعر کہتا ہے کہ اس خاک ہند میں عظیم بزرگوں کی نشانیاں محفوظ ہیں۔ ان بزرگوں میں گوتم بدھ، سرمد، اکبر اور رانا پرتاپ جیسی عظیم شخصیات شامل ہیں۔

چوتھا بند: شاعر کا خیال ہے کہ مذکورہ بزرگوں کا اثر اب بھی اس خاک ہند میں باقی ہے اور ان کا لہو ہندوستانیوں کی رگوں میں جاری ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ناقوس اور اذان کی آواز اب بھی اس سرزمین پر گونج رہی ہے۔ کشمیر اب بھی جنت نظیر ہے اور دریائے گنگا اب بھی اس سرزمین پر رواں ہے۔

پانچواں بند: شاعر کا خیال ہے کہ خاک ہند کی عظمت اب بھی باقی ہے کیونکہ پھولوں اور پھلوں میں پہلے جیسی ہی تازگی ہے۔ طاؤس جنگل میں رقص کر رہے ہیں جو کہ خاص ہندوستان کا پرندہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے دل کے حوصلے پست ہیں ورنہ بادلوں کی بجلی میں اب بھی وہی آواز ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ ہندوستان ایک ایسی انجمن ہے جس کی شمع بجھ چکی ہے گرچہ انجمن باقی ہے ٹھیک اسی طرح جیسے وطن کی خاک تو وہی ہے لیکن اس سے جو محبت پہلے ہندوستانیوں میں تھی اب نہیں ہے۔

چھٹا بند: چکبستؔ لکھنوی ہمیں خبردار کرتے ہیں کہ زمانہ برسوں سے ہمارا دشمن ہے اور دنیا سے ہمارا نام ونشان مٹا رہا ہے۔ ہماری نیند موت کی نیند میں تبدیل ہو چکی ہے لہٰذا ہمارا ملک ہندوستان بے گور وکفن لاش کی مانند نظر آتا ہے۔ ہندوستانی عیش وطرب کی غفلت میں گرفتار ہیں۔ اس لیے ہمارے ملک کا علم، کمال اور ایمان ضائع ہو رہا ہے۔

ساتواں بند: چکبستؔ لکھنوی کی خواہش ہے کہ غافل ہندوستانیوں کو وطن کی محبت کا صور پھونک کر بیدار کیا جائے تاکہ بے جان طبیعتوں کی افسردگی ختم ہو اور اس راکھ میں دبی چنگاریاں شعلے بن سکیں۔ ایسا تبھی ممکن ہے جب وطن کی محبت ہماری آنکھوں کا نور، سر کا خمار اور دل کا سرور بن جائے۔

آٹھواں بند: چکبستؔ لکھنوی کی دعا ہے کہ باغ کی خواہش رکھنے والوں کو سرو وسمن اور رنگین طبیعتوں کو رنگِ سخن ملے۔ بلبل کو گل اور گل کو چمن ملے یعنی سب کی مرادیں پوری ہوں۔ لیکن ہم بے کس ہندوستانیوں کو بھی ان کا پیارا وطن ملے اور انھیں بھی خوشیاں ملیں کیونکہ وہ اسی خاک سے پیدا ہوئے ہیں اور اسی خاک میں مرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

نواں بند: چکبستؔ لکھنوی نے وطن کی نئی سحر کو دودھ کی نہر سے تشبیہہ دی ہے اور وطن کی خوشحالی کو اپنی آنکھوں کی روشنی قرار دیا ہے۔ وطن کے ہر ذرّے کو سورج سے بہتر مانا ہے۔ وہ وطن میں ملنے والی تکلیف کو خوشیوں سے کم نہیں سمجھتے۔ اس خاکِ ہند کے گرد وغبار کو بیش قیمت لباس سمجھتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ موت کے بعد انھیں وطن کی خاک کا کفن ملے جسے وہ اپنے لیے سب سے بڑا اعزاز مانتے ہیں۔

11.7 ''خاکِ ہند'' کا عمومی جائزہ

چکبستؔ لکھنوی اردو کے معروف نظم نگار شاعر ہیں۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور انھیں نثر پر بھی قدرت حاصل تھی۔ ان کی نثری تصانیف میں ڈراما ''کملا''، ''مضامینِ چکبست''، ''معرکۂ چکبست وشرر''، ''مباحثۂ گلزارِ نسیم'' شامل ہیں۔

چکبستؔ لکھنوی ایک فطری شاعر ہیں۔ان کی نظموں میں سادگی، روانی اور مترنم فضا ملتی ہے۔ان کی اکثر نظمیں حب الوطنی کے جذبے سے سرشار اور لبریز ہیں جن میں بیداریِ وطن کے جذبات، آزادی کی تڑپ اور دردمندی کے پہلو نمایاں ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی جذبات وخیالات کو اپنی نظموں میں جگہ دی ہے۔ان میں قومی شعور، وطنیت کے نئے تقاضے اور ہندوستان میں ابھرنے والی نئی قدروں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

چکبستؔ لکھنوی کی زبان اثر انگیز ہے جس پر لکھنؤ کی تہذیب کا رنگ گہرا ہے۔انھوں نے رائج اسلوب میں نئے خیالات اور نئے جذبات کو پیش کیا ہے۔ان نظموں میں خوبصورت انداز اور دلکشی نظر آتی ہے۔اپنی نظموں کے ذریعے چکبستؔ لکھنوی نے غلام ہندوستان کے لوگوں کو محبت اور دردمندی کے ساتھ بیداری کا نغمہ سنایا اور وطن کی محبت کا جذبہ عام کیا۔حب الوطنی اور پرخلوص دردمندی چکبستؔ لکھنوی کی نظموں کی انفرادیت ہے۔

خود جانچنے کا سوال

ذیل کے سوال کا جواب پندرہ (۱۵) سطروں میں لکھیے۔

(۲) چکبستؔ لکھنوی کی نظم ''خاکِ ہند'' کا عمومی جائزہ لیجیے۔

11.8 خلاصہ

اس اکائی میں اردو کے اہم نظم نگار چکبستؔ لکھنوی کا تعارف کراتے ہوئے ان کی حیات اور شعری خدمات کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کی نظم ''خاکِ ہند'' کا مرکزی خیال واضح کرتے ہوئے اس کی تشریح کی گئی ہے۔چکبستؔ لکھنوی کی حیات اور خدمات کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے ان کے کلام کا فنی تجزیہ بھی شامل کیا گیا ہے۔اس اکائی میں پوچھے گئے سوالات کے جوابات بھی فراہم کیے گئے ہیں تاکہ اس اکائی کے تحت جو اہم سوالات ہیں ان کے جوابات دینے میں طلبا کی رہنمائی ہو سکے۔اس اکائی میں جو مشکل الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کو معانی کے ساتھ درج کیا گیا ہے اور طلبا کے استفادہ کے لیے چند اہم کتابوں کی سفارش بھی کی گئی ہے۔توقع ہے کہ طلبا ان سے استفادہ کریں گے۔

11.9 نمونہ برائے امتحانی سوالات

ذیل کے سوال کا جواب تیس (۳۰) سطروں میں لکھیے۔

۱۔ چکبستؔ لکھنوی کی حیات اور شعری خدمات پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

ذیل کے سوال کا جواب پندرہ (۱۵) سطروں میں لکھیے۔

۲۔ چکبستؔ لکھنوی کی نظم ''خاکِ ہند'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ حسب ذیل بندوں کی اپنے الفاظ میں تشریح کیجیے۔

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری　　چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری　　چشم و چراغِ عالم تھی سر زمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہر دانش اس وادیٔ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو　　سرمدؔ نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو　　سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
سب سوربیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں، یا ان کی ہڈیاں ہیں

11.10 فرہنگ

جبیں : پیشانی
عیاں : ظاہر
دل نشیں : دل میں بیٹھنے والا
وحشت : خوف
چشم و چراغِ عالم : دنیا کی بینائی
تاباں : چمک دار
کہن : قدیم
جامِ الفت : محبت کا پیالہ
پنہاں : پوشیدہ
فغاں : فریاد
شوکت : دبدبہ، شان
پستی : نیچائی
اجل : موت
عیش و طرب : چین اور خوشی
حبّ قومی : وطن کی محبت
شرارے : چنگاریاں
سرو : لمبا اور سیدھے قد والا درخت
رنگِ سخن : شاعری کا رنگ

نورِ حسنِ ازل : ہمیشہ سے موجود خدا کا نور
اوجِ عزّ و شان : عزت اور شان کی بلندی
آبیاری : آب پاشی، سینچائی
ابر : بادل
انجمن : مجلس
مہرِ دانش : دانائی کا سورج
معبد : عبادت کی جگہ
سوربیر : جری بہادر
ناقوس : سنکھ، عبادت کا گھنٹہ
فردوس گوش : بہشت میں سنائی دینے والی آواز
طاؤس : مور
زماں : وقت
خوابِ گراں : طویل نیند
صور : سنکھ، قرنا
افسردگی : ٹھٹھرن، کمھلاہٹ
شیدائے بوستاں : پھول کا دیوانہ
سمن : ایک سفید پھول
جوئے شیر : دودھ کی نہر

نورِ سحر	:	صبح کی روشنی	جلوہ	:	نمائش
رشکِ مہر	:	سورج کی برابری	منزلِ کہن	:	قدیم پڑاؤ
برگِ گل	:	پھول کی پتّی	خِلعت	:	سراپا لباس، پوشاک

11.11 معاون کتب

۱۔ صبحِ وطن : چکبستؔ لکھنوی
۲۔ چکبستؔ : رام لعل نابھوی
۳۔ انتخابِ منظومات : برج نرائن چکبست مرتبہ کشور آرا
۴۔ چکبستؔ، حیات اور خدمات : ڈاکٹر افضال احمد
۵۔ چکبستؔ اور باقیاتِ چکبستؔ : کالیداس گپتا رضا
۶۔ یادگارِ چکبستؔ : مرتبہ آنند نرائن ملاّ
۷۔ چکبستؔ بحیثیت قومی شاعر : ڈاکٹر خورشید ارمان
۸۔ چکبستؔ : سرسوتی سرن کیف
۹۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری : گوپی چند نارنگ

اکائی 12 البیلی صبح (جوش ملیح آبادی)

اکائی کے اہم اجزا

12.1 اغراض ومقاصد

12.2 تمہید

12.3 شاعر کا تعارف

12.4 جوش کا عہد

12.5 جوش کی شاعرانہ خصوصیات

12.6 زبان واسلوب

12.7 متن: نظم ''البیلی صبح''

12.8 نظم کا خلاصہ

12.9 خلاصہ

12.10 نمونہ برائے امتحانی سوالات

12.11 فرہنگ

12.12 معاون کتب

12.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں جوش کا تعارف، ان کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کی نظم ''البیلی صبح'' کی تشریح وتجزیہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سبق کے ذریعہ طلبہ نظم کی منظر کشی فطرت اور مطالعہ کائنات سے آشنا ہوں گے۔ اس سبق کے ذریعہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ نظم سے متعلق صنف زبان، اسلوب وغیرہ کی معلومات طلبہ کو فراہم ہوسکیں۔

اس سبق کو پڑھ لینے کے بعد طلبہ سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ:

☆ جوش کا تعارف کرا سکیں

☆ جوش کی شاعرانہ خصوصیات بیان کرسکیں

☆ جوش کی زبان واسلوب پر اظہار خیال کرسکیں

☆ جوش کی نظم ''البیلی صبح'' کی تشریح کرسکیں

☆ جوش کی نظم ''البیلی صبح'' کا تجزیہ پیش کرسکیں۔

12.2 تمہید

جوش ملیح آبادی اردو شاعری میں طوفان بادو باراں کی طرح داخل ہوئے اور آسمان ادب پر چھا گئے۔انہوں نے حسن وعشق کے راگ بھی چھیڑے ہیں۔مناظر وفطرت پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔تحریک آزادی، ملک کے درپیش مسائل کو بھی پیش کیا۔اسی لیے جوش کو شاعر شباب، شاعر فطرت اور شاعر انقلاب کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔اس اکائی میں جوش کی مشہور نظم :البیلی صبح: کی تشریح کی جائے گی اور نظم کا جائزہ لینے کے ساتھ ہی ان کے فن کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔

12.3 شاعر کا تعارف

جوش کا پورا نام شبیر حسن خان تھا، پہلے شبیر تخلص کیا کرتے تھے بعد میں جوش ملیح آبادی کے نام سے لکھنے لگے۔۱۸۹۸ء میں ملیح آباد میں پیدا ہوئے ،ابتدائی تعلیم روایت کے مطابق گھر پر ہی حاصل کی۔عربی وفارسی زبان میں اچھی استطاعت حاصل کی۔مزید تعلیم کے لئے آگرہ، علی گڑھ، سیتاپور اور لکھنو گئے۔علم وادب کی روایت خاندان میں بزرگوں سے چلی آرہی تھی۔ان کے باپ، دادا اور پردادا شاعر اور ادیب تھے۔

ان کے پردادا فقیر محمد خان گویا اپنے زمانے کے مشہور ومعروف شاعر تھے۔نو سال کی عمر سے جوش بھی شعر کہنے لگے تھے۔۱۹۱۶ء میں جوش اپنے والد کے انتقال کے بعد کلکتہ چلے گئے، وہاں پر ان کی ملاقات رابندر ناتھ ٹیگور سے ہوئی، جوش رابندر ناتھ ٹیگور سے بہت متاثر ہوئے ،اوران ہی کے اثر سے وہ تخلیقی نثر اور شعروادب کی طرف مائل ہوئے ۱۹۱۴ء میں جوش حیدرآباد چلے گئے اور وہاں پر وہ عثمانیہ یونی ورسٹی کے دارالترجمہ میں ناظر ادب کے عہدے پر فائز ہوئے ۱۹۳۴ء میں وہ دہلی آگئے اور یہاں پر؛قلم؛ کے عنوان سے ایک رسالہ نکالا۔آزادی کے بعد دہلی میں سکونت اختیار کرلی اور یہاں پر وہ سرکاری رسالے؛آج کل؛ کے مدیر ہوگئے۔۱۹۵۵ء میں جوش کو ان کی ادبی خدمات کے صلے میں حکومت ہند نے؛پدم بھوشن؛ کے اعزاز سے نوازا۔

۱۹۵۶ء میں جوش پاکستان چلے گئے اور وہاں پر وہ ایک عرصہ تک ارد وکراچی بورڈ میں اردو لغت پر کام کرتے رہے۔۱۹۸۲ء میں شہر کراچی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

جوش کے ادبی خزانے میں روح ادب، شعلہ وشبنم، حرف حکایت، سنبل وسلاسل، اور طویل نظموں کا ایک مجموعہ حرف آخر ہیں۔نثر میں ان کی خودنوشت؛یادوں کی بارات؛ ملتی ہے، جوش نے نظموں کے علاوہ غزلیں اور رباعیات بھی کہی ہیں مگر ان کی پہچان ایک نظم نگار کی حیثیت سے زیادہ ہے۔

12.4 جوش کا عہد

جوش کا دور غزل اور نظم کا دور تھا، یہ دور علم کے عروج کا دور تھا، اس دور میں سائنس نے زبردست ترقی کی تھی لہٰذا سائنس کے نقطہ نظر کے تحت شعروادب کی بھی جانچ پرکھ ہونے لگی۔الطاف حسین حالی نے اس دور میں غزل پر سخت نقطہ چینی کی تھی،

غزل میں حالات بدلے اور شعرادب کا دائرہ بھی وسیع ہوا اس کے ساتھ نظم نے بھی نئی منزلوں کی طرف قدم بڑھائے اور اس کے اندر بھی غزل کی طرح سے ہر طرح کے موضوعات پر اظہار خیال کیا جانے لگا، اس عہد میں مختصر، طویل، پیچیدہ اور ہر طرح کی نظمیں عالم وجود میں آئیں۔

بہت پہلے کہا گیا تھا کہ ایک دن ساری دنیا کا ادب ایک ہوگا، کم سے کم اس عہد میں یہ تو ہوا کہ دوسری زبانوں کا ترجمہ اردو میں عام ہوا، ڈرامے، ناول، افسانے اردو میں منتقل ہوئے، نظم میں بھی ترجمے ہوئے، غرض یہ کہ تراجم کے نقطۂ نظر سے یہ دور بڑا ہی زرخیز رہا ہے، اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک نے فروغ پایا اس تحریک نے اردو نثر و نظم کو بڑا فائدہ پہنچایا۔ یہ دور شعرائے عہد جدید کے نام سے جانا جاتا ہے، اس دور میں غزل اور نظم کے بڑے مشہور شعراء ہوئے، جنھوں نے نظم کے میدان میں بڑے نام روشن کئے ہیں، ایسے شعراء جو کہ جوش کے عہد کے شعراء تھے ان میں سیماب اکبر آبادی، اثر لکھنوی، جگر مرادآبادی، یگانہ چنگیزی، فراق گورکھپوری، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، احسان دانش، اورن، م راشد وغیرہ کافی مشہور ہیں۔

12.5 جوش کی شاعرانہ خصوصیات

جوش کی شخصیت اردو ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔ جوش بیسویں صدی کے ایک عظیم نثر نگار مانے جاتے ہیں اسی کے ساتھ جوش کو شاعر انقلاب، شاعر شباب، اور شاعر فطرت کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، وہ نظم کے بے تاج بادشاہ کہلاتے ہیں۔ جوش نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن وہ اپنی انقلابی اور رومانی شاعری کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ ان کی نظموں میں ہم کو اکثر و بیشتر اخلاقیات اور سیاسیات کا درس ملتا ہے، وہ گھن گرج کے شاعر ہیں، ان کی ابتدائی نظمیں فطرت کی منظر کشی کی بہترین مثالیں ہیں، جوش کو الفاظ کا جادوگر بھی کہا جاتا ہے وہ اپنے الفاظ کے ذخیرے کے ساتھ جب وہ منظر کشی کرتے ہیں تو ان کی یہ تصویر ایک اچھے اور منجھے ہوئے مصور کی پینٹنگ معلوم ہوتی ہے۔ وہ ہر منظر کو ایک کامیاب مصور کی طرح سے پیش کرتے ہیں۔

جوش کی نظمیں انسان کو قوت عمل بخشتی ہیں کیونکہ ان کی نظموں میں اصلاحی رنگ بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ جوش کی نظموں میں رنگینی اور ندرت خیال بھی بخوبی ملتا ہے۔ جوش نے اپنی قوم اور ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہونے کو للکارا ہے۔ غرض یہ کہ جوش کو ایک انقلابی اور رومانی شاعر ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

ان کے ادبی خزانے میں؛ روح ادب؛ شعلہ و شبنم؛ حرف و حکایت؛ سنبل و سلاسل اور حرف آخر ہیں جب کہ نثر میں ان کی خودنوشت؛ یادوں کی بارات؛ ہے جوش نے نظموں کے علاوہ غزلیں اور رباعیات بھی کہی ہیں۔

12.6 زبان واسلوب

جوش ہماری زبان کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے جوش کا رتبہ بہت بلند ہے۔ جوش کو زبان پر مکمل عبور حاصل ہے۔ وہ اپنی شاعری میں الفاظ کو انتخاب اور ترتیب کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کو بجا طور پر لفظوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے پیکر تراشی میں جوش کو بڑی مہارت حاصل ہے تشبیہات اور استعارات میں بے حد لطافت پائی جاتی ہے۔

جوش کے کلام میں پُر شور بلند آہنگ اور کرخت قسم کی موسیقیت پائی جاتی ہے۔ زبان پر ان کو حاکمانہ قدرت حاصل تھی، اپنی شاعری میں وہ حسین الفاظ کا استعمال کرتے ہیں، مثالیں انوکھی ہیں، جوش کا انداز بیان اثر دار ہے، ان کے انداز میں جوش وخروش اور غضب کی روانی ہے۔

12.7 متن: نظم ''البیلی صبح''

نظر جھکائے عروس فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں افق کی لو تھرتھرا رہی ہے
روش روش نغمۂ طرب ہے چمن چمن جشن رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں کلی کلی گن گنگنا رہی ہے
ستارہ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگار مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے
طیور بزم سحر کے مطرب لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں
نسیم فردوس کی سہیلی گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے
کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں! یہ ہیرے کی کیل پہنے کوئی پری مسکرا رہی ہے
سحر کو مدنظر ہیں کتنی رعایتیں چشم خوں فشاں کی
ہوا بیاباں سے آنے والی لہو کی سرخی بڑھا رہی ہے
شلوکا پہنے ہوئے گلابی ہر اک سبک پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا ہوا میں پلو سکھا رہی ہے
فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں ہلال کے گرد پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے
کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر؟ چٹکتی کلیو! ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم رو میں یہ کیسی آواز آ رہی ہے؟

12.8 نظم ''البیلی صبح'' کا خلاصہ

نظم "البیلی صبح"" جوش کی نظم ہے۔ جوش نے صبح کے فطری مناظر کو بڑی ہی خوبصورت سے بیان کیا ہے۔ جوش فطرت کے شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، انھوں نے اس نظم میں فطری انداز میں صبح کے منظر کا نقشہ کھینچا ہے، ویسے تو جوش نے

فطرت کے مناظر پر بہت سے نظمیں لکھی ہیں مگر البیلی صبح کی منظر کشی بے مثال اور لا جواب ہے۔؛البیلی صبح؛ کے مناظر کو انھوں نے نہایت ہی خوبصورت اور مترنم انداز میں اس طرح سے کھینچا ہے کہ اس سے شاعر کے مزاج اور اس کی رنگینی اور رعنائی کا پتا چلتا ہے۔

جوش پہلے بند میں صبح کے حسین منظر کی عکاسی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ فطرت کی دلہن اپنی پیشانی سے اس طرح سے اندھیرا ہٹا رہی ہے جیسے کوئی دلہن اپنی پیشانی سے زلفیں ہٹا رہی ہو اور صبح کا ستارہ جھلملا رہا ہے، آسمان پر تیزی سے بدلیاں چھٹ رہی ہیں، چمن کی ایک ایک روش خوشی کے نغمے سنا رہی ہے اور ہر چمن رنگ و بو کی بہار بکھیرے ہوئے ہے۔

چمن کے پرندے شاخوں پر گا رہے ہیں اور اس کے ساتھ چمن میں ہر کلی بھی خوشی کے ترانے گنگنا رہی ہے۔صبح کے ستارے کی جھلملاہٹ اور تاروں کی مدبھری آنکھوں میں رات کی داستانیں ہیں اور چاند کی نشیلی نگاہیں بھی جادو جگا رہی ہیں۔

دوسرے بند میں جوش کہتے ہیں کہ اس حسین ماحول میں پرندے خوشی کے ترانے گا رہے ہیں اور صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جنت کا احساس دلا رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نرم ہوا پھولوں کا جھولا جھلا رہی ہے، صبح کے وقت اوس کے قطرے بیلے کی کلی پر ایسے لگ رہے ہیں جیسے کہ ہیرے کی کیل (Nose pin) پہن کر کوئی پری مسکرا رہی ہو، صبح کا حسن رات کی خونی داستان بیان کر رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جنگل سے آنے والی ٹھنڈی ہوا بھی خون کی سرخی کو بڑھا رہی ہے۔

تیسرے بند میں شاعر کہتا ہے کہ باغ کی ہری پنکھری گلابی لباس پہن کر ایسے لہلہا رہی ہے جیسے کہ مانو کوئی حسینہ اپنے سرخ دوپٹے کو ہوا سکھا رہی ہو، آسمان پر چاند کے آس پاس تارے اس طرح سے اٹھکھیلیاں کر رہے ہیں جیسے کوئی نئی نویلی دلہن اپنی پیشانی سے افشاں چھڑا رہی ہو، نظم کے آخر میں جوش کہتے ہیں کہ صبح کے وقت باغ میں کلیوں کے چٹکنے یعنی پھولوں کے کھلنے کی آوازیں آ رہی ہیں تو ان کی آوازوں کو سن کر شاعر کہتا ہے کہ اے حسین کلیو! ذرا ٹھہرو باغ کی اس نازک ہوا کے ساتھ یہ کس کی آواز آ رہی ہے جس کی وجہ سے دل میں کچھ کھٹک سی ہو رہی ہے۔

خود جانچنے کے سوال

۱۔ صبح کی فطرت کو کس چیز سے تشبیہ دی گئی ہے؟
۲۔ صبح کے منظر کو کس انداز میں پیش کیا گیا ہے؟
۳۔ نظم میں شبنم کے موتی کو کس سے تشبیہ دی گئی ہے؟
۴۔ نظم میں ہیرے کی کیل کسے پہنے ہوئے بتایا گیا ہے؟
۵۔ صبح کے وقت سرخی پھیلنے کو شاعر نے کس طرح بتایا ہے؟
۶۔ صبح کے وقت کلی کے گنگنانے سے کیا مراد ہے؟
۷۔ نظم کے آخری شعر میں شاعر چٹکتی کلیوں سے ٹھہرنے کے لیے کیوں کہتا ہے؟

12.9 خلاصہ

جوش کی نظم ؛البیلی صبح؛ کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے اس نظم کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔اس سبق کا مقصد طلبہ کو زبان و

ادب سے واقفیت کرانا ہے اوراس کے ساتھ یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ نظم کے بھرپور جائزے کے ساتھ ساتھ جوش کے عہد، صنف، زبان واسلوب، موضوع، خصوصیات، ، فرہنگ، شاعر کا تعارف، قواعد، سوالات، صنف کا آغاز وارتقاء پر زور دیا گیا ہے، اس نظم کے شاعر جوش کی سوانحی حالات، ادبی ذخیرہ، شعری سفر وغیرہ کو بھی طلبہ کے ذہن میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

نظم ؛البیلی صبح ؛ نہ صرف اپنا جائزہ پیش کرتی ہے بلکہ اس کی ذریعہ صنف نظم، ہیئت، زبان وادب کی ہی معلومات بڑھتی ہے بلکہ طلبہ میں اردو نثر ونظم کے متعلق جستجو اور پڑھنے کا شوق ہونے کا جذبہ بھی بڑھتا ہے۔

12.10 نمونہ برائے امتحانی سوالات

۱۔ نظم البیلی صبح کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں؟

۲۔ جوش کی سوانح حیات لکھیں؟

۳۔ جوش کی شاعرانہ خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

12.11 فرہنگ

عروس	دلہن	جبیں	پیشانی، ماتھا
سحر	صبح	اُفق	آسمان کا کنارہ
روش	کیاریوں کے بیچ کا راستہ، پگڈنڈی	طرب	خوشی
طیور	پرندے (جمع طائر)	نگار	محبوب
مطرب	گانے والا، خوش کرنے والا	نسیم	صبح ٹھنڈی ہوا
فردوس	جنت	بیلے	ایک قسم کی بیل
رعایتیں	خیال	فشاں	چھڑکنے والا
بیاباں	ریگستان جنگل	شلوکا	چھوٹا کرتا جو کہ کمر تک ہوتا ہے
سبک	ہلکا کم وزن	ہلال	چاند

افشاں مقیش کی باریک کترنیں جو خوبصورتی کے لیے عورتیں بالوں پر چھڑکتی ہیں یا ماتھے پر چنتی ہیں، چمک

12.12 معاون کتب

۱۔ اردو شاعری کی تنقیدی جائزہ ڈاکٹر سنبل نگار

۲۔ فن شاعری اخلاق حسین دہلوی

اکائی 13 تنہائی (فیض احمد فیض)

اکائی کے اہم اجزا

13.1 اغراض ومقاصد

13.2 تمہید

13.3 فیض کا تعارف

13.4 فیض کی شعری خصوصیات

13.5 فیض کی نظم ''تنہائی'' کا تعارف

13.6 متن: تنہائی

13.7 نظم ''تنہائی'' کا تجزیہ

13.8 نمونہ برائے امتحانی سوالات

13.9 فرہنگ

13.10 معاون کتب

13.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں ہمیں فیض احمد فیض کی نظم تنہائی کے مطالعے کا موقع ملے گا جس کے ذریعہ ہم ان کی گہرائیوں اور انفرادی نقطہ نظر سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔ نظم میں انسانی زندگی کے عام تجربے یعنی انتظار کو موضوع بنایا گیا ہے، اور انتظار کے گرداب میں گھرے ہوئے شخص کی ذہنی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ:

☆ فیض احمد فیض کی نظم نگاری کی خصوصیات کو بیان کرسکیں۔

☆ نظم تنہائی کی تشریح کرسکیں گے۔ اور اس میں موجود فنی کمال کا نمونہ پیش کرسکیں۔

13.2 تمہید

فیض احمد فیض اردو کے اُن چند شعرا میں سے ہیں جنہیں قلیل کلام کے باوجود غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اور جو بہت کم مدت میں بلند ادبی مقام کے مالک ہوئے۔

فیض ایک ایسے دور سے تعلق رکھتے ہیں جس میں زندگی ہر لمحہ تغیرات اور تبدیلیوں سے دوچار تھی اور ذہن وفکر نئی منزلوں

کو طے کرتے ہوئے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے ایک طرف تو انقلاب سے عام دلچسپی بڑھتی جارہی تھی دوسری جانب نئی تبدیلیاں ،تغیرات اورنت نئے نظریات انسانی زندگی اورذہنوں کوامتحان میں مبتلا کیے ہوئے تھے۔اس زمانے میں اردوشاعری سرسیدتحریک کے اخلاقی واصلاحی رجحان اورواعظانہ انداز بیان سے آگے بڑھ کر رومانوی رجحان اورانقلاب پسندی سے ناتا جوڑ چکی تھی۔اسی دورمیں علامہ اقبال نے اردوشاعری کوایک نیارنگ وآہنگ عطا کیا اوراس میں فکروفن کے ایسے نمونے پیش کیے جواردوشعروادب میں معیاری اورامتیازی حیثیت کے حامل ہونے کے ساتھ اپنے اندر گہری سماجی بصیرت،فلسفیانہ فہم وادراک اورترقی پسندعناصر رکھتے تھے۔۱۹۳۶ء کے بعداردوشاعری کے میدان میں جونسل سامنے آئی اس میں ایک طبقہ ایسا تھا جس نے روایت کااحترام کرتے ہوئے اعتدال پسندی کارویہ اختیار کیادوسرے طبقے نے ترقی پسندتحریک کے زیراثر اشتراکی نقطہ نظر کی نشرواشاعت اورانقلاب پسندی کوشاعری کامقصد بنایا،تیسرے طبقے نے مذکورہ باتوں سے قطع نظر شاعری میں شعوراورتاثیر پرتوجہ دی۔احساس کی شدت غوروفکر کوملحوظ رکھااورترقی پسندانہ نظریات کے ساتھ عام انسانی زندگی کے معاملات،احساسات،جذبات اورمسائل کوفن کی اعلیٰ سطح سے پیش کرنے کی کوشش کی فیض اسی موخرالذکر طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کے یہاں رومانویت اورحقیقت کاایک دلکش امتزاج ملتا ہے۔

13.3 فیض کاتعارف

فیض ۱۹۱۱ء میں قصبہ قادرضلع سیالکوٹ (پاکستان) میں پیدا ہوئے تھے۔ان کے والد چودھری سلطان محمدخاں سیالکوٹ کے مشہور بیرسٹراورادب دوست انسان تھے۔فیض کی ابتدائی تعلیم مذہبی ماحول میں ہوئی کم عمری میں ہی انھوں نے قرآن کریم حفظ کرلیا تھا۔۱۹۲۱ء میں وہ لاہور کے مشن ہائی اسکول میں داخل ہوئے اور۱۹۲۷ء میں فرسٹ ڈویژن میں انٹرکاامتحان پاس کیا۔۱۹۳۱ء میں انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہورسے بی۔اے اورپھرعربی میں بی۔اے آنرکیا۔۱۹۳۳ء میں اسی کالج سے انگریزی میں ایم۔اے کیا اور۱۹۳۴ء میں اورینٹل کالج لاہورسے عربی میں ایم۔اے کی ڈگری لی۔ ۱۹۳۵ء میں امرتسر کے ایم۔او۔اے کالج میں لکچرر کی حیثیت سے ان کاتقررہوگیا پھر۱۹۴۰ء میں وہ لاہور کے ہیلی کالج میں انگریزی کے استاد مقررہوئے۔۱۹۴۱ء میں ان کاپہلاشعری مجموعہ ''نقش فریادی'' شائع ہوا۔اسی سال انھوں نے درس وتدریس کے پیشے کوخیرباد کہہ کرفوج میں ملازمت کرلی۔کیپٹن کے عہدہ پران کاتقررہوااوروہ لاہورسے دہلی آگئے۔۱۹۴۳ء میں انہیں میجر کے عہدہ پرترقی دی گئی اور۱۹۴۴ء میں وہ کرنل کے عہدہ پرفائز ہوئے۔۱۹۴۷ء میں وہ فوجی ملازمت سے استعفیٰ دے کرلاہور چلے گئے اور''پاکستان ٹائمز''اور''امروز'' کے مدیرمقررہوئے۔اس سے پہلے ۱۹۳۸ء میں وہ''ادب لطیف'' کی ادارت کے فرائض انجام دے چکے تھے۔

فیض نے اپنی زندگی میں قیدوبند کی صعوبتیں بھی اُٹھائیں۔۱۹۵۱ء میں وہ سازش کیس کے سلسلہ میں گرفتارہوئے اس کے بعد۱۹۵۸ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کئے گئے اورکئی سال جیل میں بندرہے۔

فیض کی علمی وادبی سرگرمیوں کاسلسلہ۱۹۳۴ء میں ان کے ایک مضمون کی اشاعت سے شروع ہواتھا۔''ادب لطیف'' کی ادارت کے دوران اسے اورہوا ملی،۱۹۶۳ء میں ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ''میزان'' شائع ہوا،۱۹۷۲ء میں خطوط کا مجموعہ''صلیبیں میرے دریچے میں''،۱۹۷۳ء میں تقاریراورمتفرق تقریروں پرمشتمل مجموعہ''متاعِ لوح وقلم'' اور۱۹۷۴ء میں

''سفرنامہ کیوبا'' شائع ہوئے اس کے علاوہ ان کے دواور شعری مجموعے ''مدد سال آشنائی اور ''قرض دوستاں'' بھی ہیں۔شعری مجموعوں میں ''نقش فریادی'' کے بعد ۱۹۵۲ء میں ''دست صبا'' ۱۹۵۶ء میں ''زنداں نامہ'' ۱۹۶۵ء میں ''دستِ تہہ سنگ'' ۱۹۷۱ء میں ''سرِوادیٔ سینا'' ۱۹۷۸ء میں ''شامِ شہریاراں'' ۱۹۸۱ء میں ''میرے دل مرے مسافر'' شائع ہوکر منظر عام پر آئے۔

فیض نے اپنی زندگی میں اپنے نظریات، خیالات اور اپنے افکار کی بنا پر عالمی سطح پر غیر معمولی مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔اسی ذیل میں انھوں نے دنیا کے مختلف مما لک میں منعقد ہونے والی مختلف کانفرنسوں میں شرکت کی، مختلف علمی وادبی انجمنوں کے ممبر نامزد ہوئے، مختلف مما لک کے دورے کیے اور کئی اعزازات سے نوازے گیے۔

انہوں نے ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کی پہلی کانفرنس جو تاشقند میں منعقد ہوئی تھی اس میں ترقی پسند تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے شرکت کی۔۱۹۷۲ء میں وہ قومی ادبی اکادمی پاکستان کے صدر منتخب ہوئے تھے انھوں نے جن مما لک کے لمبے سفر کیے ان میں انگلستان، روس، الجیریا، شام، عراق، مصر، لبنان، اور ہنگری خاص ہیں۔۱۹۶۲ء میں انہیں بین الاقوامی لینن انعام تفویض کیا گیا تھا۔

۲۰ر نومبر ۱۹۸۴ء کو لاہور میں فیض کی وفات ہوئی۔

13.4 فیض کی شعری خصوصیات

دراصل فیض فنکاری اور ندرت تخیل کے شاعر ہیں ان کے یہاں ندرت تخیل ان کے دور کی زندگی اور اس کے کوائف کو پیش کرتی ہے اور نئی نفسیاتی کیفیات و نئے تجربات اس کی گرفت میں نظر آتے ہیں۔فیض کا کمال سیدھے سادے الفاظ اور پیرائے میں غیر معمولی تاثیر اور معنویت پیدا کرنے میں سامنے آتا ہے ان کے یہاں یہ معنویت زندگی کے عرفان اور حقیقت کے ادراک سے اور اپنے عہد کے حالات کے گہرے شعور سے پیدا ہوئی ہے تو احساسات کی شدت، خلوص، ہمدردی اور اعلیٰ فن کارانہ صلاحیت نے تاثیر کو جنم دیا ہے۔اور اسی بنا پر ان کی شاعری میں گہری معنویت غیر معمولی بصیرت کے ساتھ بڑا سوز، درد اور وجدانی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

فیض کی شاعری کی ابتدا غزلوں سے ہوئی۔''نقش فریادی'' میں مجموعہ کی ضخامت کے لحاظ سے غزلوں کی تعداد خاصی ہے لیکن فیض کی اصل خصوصیت اور ان کی انفرادیت ان کی نظموں میں پورے طور پر نظر آتی ہے۔ان کی نظموں میں روایت اور انحراف کا ایک انوکھا امتزاج ملتا ہے۔تجربے حقیقت پر مبنی معلوم ہوتے ہیں، واقعیت احساس میں ڈوب کر ابھرتی ہے۔ان میں تاثیر کے ساتھ معنوی گہرائی فنکاری کے ساتھ جامعیت اور تصور کے ساتھ حقیقت جا بجا محسوس ہوتی ہے۔فیضؔ کی شاعری کا رجحان خارجیت سے داخلیت کی طرف زیادہ ہے اور شاعر کی ذات اس کا مرکز ہے اور یہ ذات خارجی اور داخلی کشمکش کا شکار ہے جس نے اسے المیہ بنا دیا ہے۔فیضؔ کی یہ ''المیہ ذات'' ان کی شاعری میں ہر جگہ ہر مقام پر موجود ہے جس نے ان کی شاعری میں احساسات کی ایک وسیع دنیا آباد کردی ہے۔اس احساس کی وسیع دنیا کے تحت فیض اپنی شاعری میں حسن کی پرستش کرتے، حقیقت کی طرف راغب ہوتے اپنے زمانے کے نامساعد حالات اور مسائل پر نگاہیں ڈالنے اور اپنے عصر کے فلسفہ کو اپنے ذہن، مزاج اور فطرت کے مطابق قبول کرتے ہیں جس کی بنا پر ان کی شاعری میں ان کے جذباتی، انفرادی اور عمرانی واجتماعی تجربات ایک نئی شکل میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں اور شاعری میں شعریت درد واثر اور نغمگی کی ایک نئی کیفیت ملتی ہے۔

فیض کے یہاں انفرادی جذبات، ذہنی کشمکش اور قلبی کیفیات کے ساتھ احساسات کی ہم آہنگی اور انفرادی تجربات کی حسیاتی کیفیت کے فنکارانہ اظہار کا نمونہ ان کی نظم ''تنہائی'' ہے۔

13.5 فیض کی نظم ''تنہائی'' کا تعارف

''ہر وہ چیز جس سے ہماری زندگی میں حسن یا لطافت یا رنگینی پیدا ہو، جس کا حسن ہماری انسانیت میں اضافہ کرے، جو ہماری روح کو مترنم کرے، جس کی لو سے ہمارے دماغ کو روشنی اور جلا حاصل ہو۔ صرف حسین ہی نہیں، مفید بھی ہے'' (فیض احمد فیض)

فیض کے مذکورہ خیال کی روشنی میں فیض کی نظم کا مطالعہ اور اس کے مفہوم سے واقفیت ذہن وفکر اور جمالیاتی احساس کے لیے مفید ہے اس کے مطالعہ سے نہ صرف قاری کے جذبات واحساسات پر گہرا اثر مرتب ہوتا ہے بلکہ اردو کے غنائیہ ادب کی اہمیت واثر انگیزی ثابت ہوتی ہے اور فیض کی شاعری کی نمایاں خصوصیات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

''تنہائی'' اردو کے مقبول شاعر فیض احمد فیضؔ کی مشہور نظم ہے۔ نو مصرعوں پر مشتمل یہ نظم فیضؔ کے پہلے شعری مجموعے ''نقشِ فریادی'' میں شامل ہے فیض کا یہ شعری مجموعہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا، اس مجموعہ کی اشاعت کے ساتھ ہی فیض کو اردو دنیا میں غیر معمولی مقبولیت اور شہرت ملی اور ایک مستقل ادبی مقام حاصل ہو گیا تھا۔ نظم ''تنہائی'' اگر چہ ایک مختصر شعری تخلیق ہے لیکن نظم میں شاعر نے تنہائی میں گھرے ہوئے انسان کی ذہنی ونفسیاتی کیفیات اور انتظار کی شدت اور انتظار کے لمحات کے دوران میں اس کے جذبات، احساسات اور مختلف کیفیات کو جس فن کارانہ انداز میں پیش کیا اُس نے اس نظم میں بڑی اثر انگیزی پیدا کر دی ہے۔ اسی بنا پر فیض کی یہ نظم ان کی بہترین نظموں میں شامل ہے۔

13.6 متن: ''تنہائی''

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار
اجنبی خاک نے دھندلا دئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفّل کرلو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

13.7 ''تنہائی'' کا تجزیہ

نظم ''تنہائی'' بقول پروفیسر کلیم الدین احمد ایسی نظم ہے جس میں ''گہرائی بھی ہے اور انفرادی شان بھی''۔ نظم نو مصرعوں پر مشتمل ''معریٰ'' نظم ہے۔ اس کا انداز خود کلامی کا سا ہے جس میں شاعر خود سے ہی سرگوشیاں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

نظم کا مرکزی خیال انتظار میں گھرے ہوئے تنہا انسان کی امید اور ناامیدی کے ساتھ شدید مایوسی اور محرومی سے پیدا ہونے والی ذہنی و نفسیاتی کیفیات کی پیش کش ہے۔ نظم میں عام انسانی زندگی کے عام تجربہ یعنی انتظار کو موضوع بنایا گیا ہے اور انتظار کے گرداب میں گھرے ہوئے تنہا شخص کی ذہنی کیفیت کی عکاسی کی گئی ہے۔

نظم کی ابتدا انتظار کی انتہا سے ہوتی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے انتظار کی کشمکش میں مبتلا تنہا انسان کی داخلی کیفیات کو بالواسطہ طریق کار سے پیش کیا ہے۔ انتظار کی بے چینی اور بے قراری جب بہت بڑھ جاتی ہے۔ آنکھیں انتظار کرتے کرتے تھک جاتی ہیں اور ناامیدی اس پر حاوی ہونے لگتی ہے تو ہلکی سی آہٹ شاعر کے تھکے ہوئے ذہن میں امید کی ہلکی سی لہر پیدا کرتی ہے لیکن انتظار کی انتہائی منزل پر پہنچا ہوا نڈھال شاعر خود ہی اپنے بے چین دل سے مخاطب ہو کر اپنی موہوم امید کو یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ یہ آہٹ کسی راہ گیر کے قدموں کی چاپ کی ہوگی جو اپنی منزل پر چلا جائے گا اسی کے بعد شاعر کا ذہن و دل مایوسی کے کہر میں ڈوب جاتا ہے اور اسے کائنات کی ہر چیز اس کہر میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اپنی داخلی محرومی کے شدید احساس کو خارجی مناظر کے ذریعہ بیان کرتا ہے وہ رات کے ڈھلنے، ستاروں کے جھرمٹ کے غائب ہونے اور محفلوں کو روشن کرنے والے چراغوں کے ٹمٹمانے کی کیفیت میں اپنی کیفیت محسوس کرتے ہوئے کہتا ہے وہ کہ کسی کی آمد کا انتظار کرتے کرتے ہر ایک راستہ سو گیا ہے یعنی امید ختم ہو چکی ہے اور ناامیدی کی خاک نے امید کے ہر نشان کو مٹا کر ہر طرف ناامیدی اور محرومی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ تمام امکانات ختم ہو چکے ہیں، سارے خواب ٹوٹ چکے ہیں اور ہر امید پامال ہو چکی ہے اس کیفیت کے بعد اپنی شدید مایوسی اور ناامیدی کو ظاہر کرنے کے لیے وہ چراغ بُجھانے اور نشہ محبت کا سامان سمیٹنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اُن آنکھوں کو جو کسی کے انتظار میں کھُلی ہوئی تھیں بند کرنے کی التجا کرتا ہے اور نقطۂ عروج پر پہنچے ہوئے انتظار کو یہ کہتے ہوئے کہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ کوئی نہیں۔ ختم کر دیتا ہے۔

فیضؔ کی اس نظم میں احساس اور جذبے کی ایک کہر آلود کیفیت طاری ہے اس کہر آلود انتظار کی فضا میں شاعر کا پورا وجود امید و ناامیدی، یقین و بے یقینی، وفا و جفا، تذبذب اور کشمکش میں گھرا ہوا نظر آتا ہے اور اس کی بے چارگی، محرومی و مایوسی کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہی خیال کی سوگواری، آنکھوں کی اُداسی، دل کی تڑپ، جسم کی تھکن و ذہن کی محرومی اپنے انتہا پر پہنچے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ نظم میں رات کا ڈھلنا تاروں کے غبار کا بکھرنا، ایوانوں کے چراغوں کا لڑکھڑانا، راستہ تک تک کر ہر ایک راہ گزر کا سو جانا اور اجنبی خاک سے قدموں کے سراغوں کا دھندلانا شاعر کی مذکورہ کیفیات کی ترجمان ہیں اور آخری مصرعے میں ''اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا'' میں کوئی نہیں کی تکرار انتہائی مایوسی کا اظہار ہے جس میں امید کا سایہ بھی نظر نہیں آتا۔

نظم مختصر ہوتے ہوئے بھی ایک وسیع ترین پس منظر رکھتی ہے اور انسانی ذہن و دل کی مختلف نازک ترین کیفیات اور مختلف النوع جذبات و احساسات کی باریکیوں کو کامیابی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ زبان و بیان اور الفاظ و تراکیب کے لحاظ سے بھی نظم شعری فن کاری کا بہترین نمونہ ہے۔

مذکورہ نظم گوشعرا میں فیض احمد فیضؔ اس لحاظ سے امتیازی مقام رکھتے ہیں کہ ان کی شاعری میں رومانویت اور حقیقت نگاری، روایت اور بغاوت اور فن کاری کا ایک انتہائی دلکش امتزاج ملتا ہے۔

13.8 نمونہ برائے امتحانی سوالات

(۱) فیضؔ احمد فیض کے حالاتِ زندگی تحریر کیجیے۔
(۲) فیض کے مشہور شعری مجموعوں کے نام لکھیے۔
(۳) فیضؔ کی شاعری کی امتیازی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔
(۴) نظم ''تنہائی'' کی تشریح کیجیے۔
(۵) فیض کی نظم ''تنہائی'' کی کامیابی کا راز موضوع کی انفرادیت میں نہیں اظہارِ بیان کی خوبی میں ہے بحث کیجیے۔

13.9 فرہنگ

دلِ زار	:	دل کو ستانے والا، ظالم	راہرو	:	راہ گیر، مسافر، راہی
غبار	:	گرد، دھول	ایوانوں	:	(ایوان کی جمع) محل، مکان
خوابیدہ	:	سویا ہوا	راہگذر	:	راستہ، سڑک
اجنبی	:	ناواقف، پردیسی	مینا	:	شراب کی بوتل
سراغ	:	کھوج، پتا، نشان	گُل کرنا	:	چراغ بجھانا
ایاغ	:	پیالہ، جام، ساغر	مقفّل	:	قفل لگا ہونا، تالا لگا ہوا ہونا

13.10 معاون کتب

(۱) نقش فریادی — از فیض احمد فیضؔ
(۲) نسخہ ہائے وفا — از فیض احمد فیضؔ
(۳) فیض کا مطالعہ — از ڈاکٹر نصرت چودھری
(۴) ترقی پسند ادب — از سردار جعفری
(۵) ترقی پسند ادب کے پچاس سال — از ڈاکٹر قمر رئیس اور عاشور کاظمی
(۶) افکار — فیض نمبر
(۷) معیار — فیض نمبر

اکائی 14 اودیس سے آنے والے بتا (اختر شیرانی)

اکائی کے اہم اجزا

14.1 اغراض ومقاصد

14.2 تمہید

14.3 شاعر کا تعارف

14.4 زبان واسلوب

14.5 متن: نظم ''اودیس سے آنے والے بتا''

14.6 نظم کے بندوں کی تشریح

14.7 عمومی جائزہ

14.8 نمونہ برائے امتحانی سوالات

14.9 فرہنگ

14.10 معاون کتب

14.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ ان کی ادبی لسانی اور وطنی محبت میں اضافہ ہوگا۔ اس کے ذریعہ طلبہ صنف کی خصوصیات اور اختر شیرانی کی نظم گوئی اور ان کی شاعرانہ عظمت سے واقف ہوسکیں گے۔

اس اکائی کو پڑھ لینے کے بعد طلبہ اس قابل ہوجائیں گے کہ وہ:

☆ اختر شیرانی کا تعارف کراسکیں

☆ اختر شیرانی کی شاعرانہ خصوصیات بیان کرسکیں

☆ اختر شیرانی کی نظم ''اودیس سے آنے والے بتا'' کی تشریح کرسکیں۔

14.2 تمہید

پچھلی اکائی میں آپ نے ایک ترقی پسند شاعر فیض کے بارے میں پڑھا۔ اس اکائی میں ہم اردو کے مشہور نظم گو شاعر اختر شیرانی کی شخصیت اور ان کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی نظم گوئی کی اہم خصوصیات کو بیان کریں گے۔ اس کے علاوہ ان کی اہم نظم؛ اودیس سے آنے والے بتا؛ کی تشریح بھی پیش کی جائے گی۔ یہ نظم وطنی محبت کا بے مثال نمونہ ہے۔

14.3 شاعر کا تعارف

اختر شیرانی کا اصل نام داؤد خان تھا اور وہ اختر تخلص کرتے تھے، اور وہ اردو ادب کے مشہور محقق حافظ محمود شیرانی کے بیٹے تھے، ان کی پیدائش ۱۹۰۹ء میں راجستھان کے شہر ٹونک میں ہوئی تھی مگر ان کی پرورش لاہور میں ہوئی تھی۔ وہاں کے ادبی ماحول نے ان کو شعر و شاعری کی طرف مائل کیا انھوں نے صابر علی خاں سے اصلاح لی۔

اختر شیرانی کے یہاں پر سنجیدہ فکر، فلسفیانہ مباحث کا گزر نہیں ہے، وہ صرف رومانی اور وطنی شاعر ہیں، ان کی نظموں میں ہر جگہ کوئی نہ کوئی حسین جلوہ گر نظر آتا ہے۔ ایک نقاد کا قول ہے کہ

> اختر کی شاعری کی روح تغزل ہے اور اس روح تغزل اور غنائیت کو اپنی تمام شاعری پر پھیلا کر الفاظ کی تراکیب اور اپنی انفرادی رنگینی سے کلام میں عجیب ولولہ پیدا کر دیتے ہیں۔

اختر دکھ بھری دنیا سے فرار چاہتے ہیں، اور تخیل کے پروں سے پرواز کر کے اس مادی دنیا سے دور تخیلات کی دنیا میں چلے جاتے ہیں، ان کی نظموں میں حسن کی مختلف کیفیات اور اداؤں سے رومانی فضا ہموار ہوتی ہے، ان کی نظم ؛ دیہات کی شام ؛ میں گاؤں کی معصوم فضا، بچوں کے کھیل کود، پنگھٹ کا منظر، گاؤں کی گوریوں کی خوش اداؤں اور ان کے زیورات وغیرہ کے ذریعہ رومانی فضا ہموار کی گئی ہے، اختر شیرانی کی نظموں میں غضب کا والہانہ پن اور لذت ہے، ان کی نظموں میں حسن پرستی کے ساتھ ساتھ حسن کاری اور حسن آفرینی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ او دیس سے آنے والے بتا ان کی شہرۂ آفاق وطنی نظموں میں شامل ہے۔

اختر شیرانی کے مجموعے ؛ شعرستان، اخترستان، صبح بہار، نغمۂ حرم، طیور آوارہ، لالۂ طور، شہ ناز اور شہ رو شائع ہو چکے ہیں۔ اس مقبول اور باکمال شاعر کا انتقال ۱۹۴۸ء میں ہوا تھا۔

14.4 زبان و اسلوب

اختر شیرانی کی رومانی نظموں میں غضب کا والہانہ پن اور لذتیت ہے، ان کی نظموں میں حسن پرستی کے ساتھ ساتھ حسن کاری اور حسن آفرینی کا بھی احساس ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں بلا کا حسن اور نغمگی اور ترنم ملتا ہے انھوں نے یہ نغمگی نرم و نازک الفاظ کے فن کارانہ استعمال مترنم بحروں کے انتخاب، لفظوں کی آہنگ، اور مصرعوں کی ترغیب سے پیدا کی ہے ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے بھی یہ نظمیں کامیاب رہی ہیں اور جدید نظم نگاری کے اصولوں پر بھی پوری اترتی ہیں۔ فنی اعتبار سے ان نظموں کو اردو کی بہترین نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی نظموں میں او دیس سے آنے والے بتا، گزری ہوئی راتیں ؛ اور وادیٔ گنگا میں ایک رات وغیرہ کامیاب نظمیں ہیں۔

14.5 متن: نظم ''او دیس سے آنے والے بتا''

بند(۱)

او دیس سے آنے والے بتا
او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یاران وطن
آوارۂ غربت کو بھی سنا کس رنگ میں ہے کنعان وطن
وہ باغ وطن فردوس وطن وہ سرو وطن ریحان وطن
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۲)

او دیس سے آنے والے بتا
کیااب بھی وہاں کے باغوں میں مستانہ ہوائیں چلتی ہیں
کیااب بھی وہاں کے پربت پر گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں
کیااب بھی وہاں کی برکھائیں ویسی ہی دلوں کو بھاتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۳)

او دیس سے آنے والے بتا
کیااب بھی وطن میں ویسے ہی سرمست نظارے ہوتے ہیں
کیا اب بھی سہانی راتوں کو وہ چاند ستارے ہوتے ہیں
ہم کھیل جو کھیلا کرتے تھے کیااب بھی وہ سارے ہوتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۴)

او دیس سے آنے والے بتا
کیااب بھی شفق کے سایوں میں دن رات کے دامن ملتے ہیں
کیااب بھی چمن میں ویسے ہی خوش رنگ شگوفے کھلتے ہیں
برساتی ہوا کی لہروں سے بھیگے ہوئے پودے ہلتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۵)

او دیس سے آنے والے بتا
شاداب شگفتہ پھولوں سے معمور ہیں گلزار اب کہ نہیں
بازار میں مالن لاتی ہے پھولوں کے گندھے ہار اب کہ نہیں
اور شوق سے ٹوٹے پڑتے ہیں نوخیز خریدار اب کہ نہیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۶)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا شام پڑے سڑکوں پہ وہی دلچسپ اندھیرا ہوتا ہے
اور گلیوں دھندلی شمعوں پر سایوں کا بسیرا ہوتا ہے
باغوں کی گھنیری شاخوں میں جس طرح سویرا ہوتا ہے
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۷)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں ویسی ہی جواں اور مدھ بھری راتیں ہوتی ہیں
کیا رات بھر اب بھی گیتوں کی اور پیار کی باتیں ہوتی ہیں
وہ حسن کے جادو چلتے ہیں وہ عشق کی گھاتیں ہوتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۸)

او دیس سے آنے والے بتا
ویرانیوں کے آغوش میں وہ آباد ہے بازار اب کہ نہیں
تلواریں بغل میں دابے ہوئے پھرتے ہیں طرحدار اب کہ نہیں
اور پہیلیوں سے جھانکتے ہیں ترکان سیہ کار اب کہ نہیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۹)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی مہکتے مندر سے ناقوس کی آواز آتی ہے

کیا اب بھی مقدس مسجد پر　　مستانہ اذاں تھراتی ہے
اور شام کے رنگیں سایوں پر　　اک عظمت سی چھا جاتی ہے
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۱۰)

او دیس سے آنے والے بتا
کیااب بھی وہاں کی پنگھٹ پر　　پنہاریاں پانی بھرتی ہیں
انگڑائی کا نقشہ بن بن کر　　سب ماتھے پہ گاگر دھرتی ہیں
اوراپنے گھروں کوجاتے ہوئے　　ہنستی ہوئی چہلیں کرتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۱۱)

او دیس سے آنے والے بتا
برسات کے موسم اب بھی وہاں　　ویسے ہی سہانے ہوتے ہیں
کیااب بھی وہاں کے باغوں میں　　جھولے اور گانے ہوتے ہیں
اور دور کہیں ؛ کچھ ؛ دیکھتے ہی　　نوعمر دوانے ہوتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۱۲)

او دیس سے آنے والے بتا
کیااب بھی پہاڑی چوٹیوں پر　　برسات کے بادل چھاتے ہیں
کیااب بھی ہوائے ساحل کے　　وہ رس بھرے جھونکے آتے ہیں
کیا رسیا کی اونچی ٹیکری پر　　لوگ اب بھی وہ بیتیں گاتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۱۳)

او دیس سے آنے والے بتا
کیااب بھی پہاڑی گھاٹیوں میں　　گھنگھور گھٹائیں گونجتی ہیں
ساحل کہ گھنیرے پیڑوں میں　　برکھا کی ہوائیں گونجتی ہیں
جھینگر کے ترانے جاگتے ہیں　　موروں کی صدائیں گونجتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۱۴)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا نوگزے کے میلوں میں وہی
پھیلی ہوئی بڑ کی شاخوں میں
اٹڈے ہوئے بادل ہوتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

برسات کا جوبن ہوتا ہے
جھولوں کا نشیمن ہوتا ہے
چھایا ہوا ساون ہوتا ہے

بند(۱۵)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا شہر کے گرداب بھی ہے رواں
جوں گود میں اپنے من کو لیے
یا نور کی ہنسلی حور کی گردن
او دیس سے آنے والے بتا

دریائے حسین لہرائے ہوئے
ناگن ہو کوئی تھرائے ہوئے
میں ہو عیاں بل کھائے ہوئے

بند(۱۶)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی فضا کے دامن میں
کیا اب بھی کنار دریا پر
کیا اب بھی اندھیری راتوں میں
او دیس سے آنے والے بتا

برکھا کے سمے پہراتے ہیں
طوفان کے جھونکے آتے ہیں
ملاح ترانے گاتے ہیں

بند(۱۷)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں برسات کے دن
معصوم و حسین دو شیزائیں
اور تیتریوں کی طرح سے
او دیس سے آنے والے بتا

باغوں میں بہارے آتی ہیں
برکھا کے ترانے گاتی ہیں
رنگیں جھولوں پر لہراتی ہیں

بند(۱۸)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی افق کے سینے پر

شاداب گھٹائیں جھومتی ہیں

دریا کے کنارے باغوں میں　　مخمور ہوائیں جھومتی ہیں
اوران کے نشیلے جھونکوں سے　　خاموش فضائیں جھومتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۱۹)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا شام کواب بھی جاتے ہیں　　احباب کنار دریا پر
وہ پیڑ گھنیرے اب بھی ہیں　　شاداب کنار دریا پر
اور پیار سے آ کر جھانکتا ہے　　مہتاب کنار دریا پر
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۲۰)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا آم کے اونچے پیڑوں پر　　اب بھی وہ پپیہے بولتے ہیں
شاخوں کے حریری پردوں پر　　نغموں کے خزانے کھولتے ہیں
ساون کے رسیلے گیتوں میں　　تالاب میں امرس گھولتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۲۱)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا پہلے سی ہے معصوم ابھی　　وہ مدرسے کی شاداب ہو
کچھ بھولے ہوئے دن گزرے ہیں　　جس میں وہ مثال خواب فضا
وہ کھیل، وہ ہم سن، وہ میداں　　وہ خواب گہہ مہتاب فضا
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۲۲)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی کسی کے سینے میں　　باقی ہے ہماری چاہ بتا
کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے　　اب یاروں میں کوئی آہ بتا
او دیس سے آنے والے بتا　　للہ بتا للہ بتا
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۲۳)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا ہم کو وطن کے باغوں میں مستانہ فضائیں بھول گئیں
برکھا کی بہاریں بھول گئیں ساون کی گھٹائیں بھول گئیں
دریا کے کنارے بھول گئے جنگل کی ہوائیں بھول گئیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۲۴)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا گاؤں میں اب بھی ویسی ہی مستی بھری راتیں ہوتی ہیں
دیہات کی کم سن ماہ وشیں تالاب کی جانب جاتی ہیں
اور چاند کی سادہ روشنی میں رنگین ترانے گاتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۲۵)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی گجردم چرواہے ریوڑ کو چرانے جاتے ہیں
اورشام کے دھندلے سایوں کے ہم راہ گھروں کو آتے ہیں
اور اپنی رسیلی بانسری سے عشق کے نغمے گاتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۲۶)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا بھانچی پہ اب بھی ساون میں برکھا کی بہاریں چھاتی ہیں
معصوم گھروں سے بھور بھئے چکی کی صدائیں آتی ہیں
اور یاد میں اپنے میکے کی بچھڑی ہوئی سکھیاں گاتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۲۷)

او دیس سے آنے والے بتا
ککراج کا خواب آلودہ سا گھاٹ اور اس کی فضائیں کیسی ہیں

وہ باغ، وہ بنگلہ، وہ تالاب　　اور اس کی ہوائیں کیسی ہیں
وہ کھیت وہ گاؤں وہ چڑیا　　اور ان کی صدائیں کیسی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۲۸)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی پرانے کھنڈروں پر　　تاریخ کی عبرت طاری ہے
ان پورنا کے اجڑے مندر پر　　مایوسی و حسرت طاری ہے
سنسان گھروں پہ چھاؤنی کے　　ویرانی و رقت طاری ہے
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۲۹)

او دیس سے آنے والے بتا
آخر میں یہ حسرت ہے کہ بتا　　وہ غارت ایماں کیسی ہے
بچپن میں جو آفت ڈھاتی تھی　　وہ آفت دوراں کیسی ہے
ہم دونوں تھے جس کے پروانے　　وہ شمع شبستاں کیسی ہے
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۳۰)

او دیس سے آنے والے بتا
مرجانہ تھا جس کا نام بتا　　وہ غنچہ دہن کس حال میں ہے
جس پر تھے فدا طفلان وطن　　وہ جان وطن کس حال میں ہے
وہ سرو چمن وہ رشک وطن　　وہ سیم بدن کس حال میں ہے
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۳۱)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی رخ گل رنگ پہ وہ　　جنت کے نظارے روشن ہیں
کیا اب بھی رسیلی آنکھوں میں　　ساون کے ستارے روشن ہیں
کیا اس کے گلابی ہونٹوں پر　　بجلی کے شرارے روشن ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۳۲)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اس کے شہابی عارض پر گیسوئے سیپ بل کھاتے ہیں
یا بحر شفق کی موجوں پر دو ناگ پڑے لہراتے ہیں
اور جن کی جھلک سے ساون کی راتوں کے سے سپنے آتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

بند(۳۳)

او دیس سے آنے والے بتا
اب نام خدا کی ہوگی وہ جواں میکے میں ہے یا سسرال میں ہے
دوشیزہ ہے یا آفت میں اسے کم بخت جوانی ڈال گئی
گھر پر ہی رہی یا گھر سے گئی خوش حال رہی خوش حال گئی
او دیس سے آنے والے بتا

14.6 نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' کے بندوں کی تشریح

تشریح بند(۱)

نظم کے اس پہلے بند میں شاعر اپنے وطن سے متعلق اپنے جذبات اور اپنے احساسات کا اظہار اس وقت کر رہے ہیں جب کہ وہ لاہور میں تھے اور ان کا کوئی ہم وطن ان سے ملاقات کے لیے آتا ہے تو ان کے جذبات اور احساسات کے ساتھ وطن کی محبت بھی ابھر آتی ہے اور وہ اس سے سوال کرتے ہیں کہ اے میرے ہم وطن تو میرے وطن سے آ رہا ہے ذرا مجھ کو بتا کہ میرے وطن کے ساتھی کس حال میں ہیں، وہ وطن جو کہ میرے لیے کنعان، باغ، اور فردوس (جنت) سے کم نہیں ہے اس فردوس کے سرو اور ریحان کس حال میں ہیں، ذرا تو ان کے بارے میں بتا اور میری بے تابی کم کر۔

تشریح بند(۲)

پردیس میں رہتے ہوئے شاعر اپنے یہاں پر آنے والے نوارد سے اپنے دیس کے موسم کے بارے میں معلوم کرتا ہے کیا اب بھی وہاں کا موسم ایسا ہی رہتا ہے جس طرح سے ہمارے بچپن میں ہوا کرتا تھا، باغوں میں مست ہوائیں چلتی تھیں، اور وطن کے پربت (رسنا اور پورنا) پر کیا اب بھی ویسی ہی گھنگھور گھٹائیں اور برکھا آ کر دلوں کو لبھاتی ہیں۔

تشریح بند(۳)

اپنے وطن عزیز جو کہ شاعر سے چھوٹ گیا ہے اس کے بارے میں وہ اپنے ساتھی سے جو کہ ان کے دیس سے آیا ہے وہ

اس سے معلوم کرتے ہیں کہ مجھے بتاؤ کہ اب بھی وہ سارے نظارے، تاروں بھری راتیں، اور وہاں کا ماحول ویسا ہی ہے۔ ہم جو اپنے بچپن میں کھیل کھیلا کرتے تھے، وہ تمام کھیل اور پیار بھرا ماحول اب بھی ویسا ہی ہے۔ ذرا مجھے بتاؤ تو سہی۔

تشریح بند (۴)

اپنے دیس سے آنے والے سے شاعر اختر شیرانی اپنے ملک کے حالات جاننے کے لیے بے چین اور بے قرار ہیں کہ کیا اب بھی وہاں پر ویسے ہی دن ڈھل کر شفق کے سائے میں رات کے آغوش میں چلا جاتا ہے، کیا اب بھی وہاں کے چمن میں ویسے ہی خوش رنگ پھول کھل کر چمن کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں اور وہاں کا برسات کا موسم کیا اب بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ ہمارے بچپن میں ہوا کرتا تھا، بارش کے بعد جب بھیگے ہوئے پودے ہوا کی لہروں سے ہلتے تھے، کیا اب بھی وہاں ویسا ہی سماں ہے۔

تشریح بند (۵)

شاعر بڑی ہی بے تابی کے ساتھ اپنے وطن سے آنے والے نوارد سے معلوم کرتے ہیں کہ مجھے بتاؤ کہ میرے وطن عزیز کے گلزار (باغات) ابھی پھولوں سے لدے رہتے ہیں کہ نہیں اور ان ہی پھولوں سے گندھے ہوئے نوجوانوں کے لیے بازار میں بیچنے والی مالنیں آتی ہیں کہ نہیں، اور جب وہ ہار لے کر آتی ہین تو ان کو خریدنے کے لیے جس طرح سے ہمارے زمانے میں لوگ ٹوٹ پڑتے تھے کیا ویسے ہی لوگ اب بھی ہار خریدنے کے لیے آتے ہیں کہ نہیں مجھے اس کے بارے میں ذرا بتلاؤ۔

تشریح بند (۶)

شاعر اختر شیرانی اپنے آنے والے نوارد سے معلوم کرتے ہیں کہ بتاؤ کی اب بھی ہمارے دیس میں شام ڈھلے سڑکوں پہ اندھیرا ہو جاتا ہے جس وجہ سے گلیوں مین شمعیں روشن ہو جایا کرتی تھیں اور شمع کی اس دھندلی روشنی میں لوگوں کے سائے گھومتے رہتے ہیں، یعنی کہ لوگ شام ڈھلے نکلتے ہیں۔ جس طرح سے باغوں کی گھنی اور اندھیری ساخوں میں روشنی چھن چھن کر آتی ہے، اسی طرح سے گاہے بگاہے سائے بھی نظر آجاتے ہیں، کیا وہاں پر اب بھی ویسا ہی دلچسپ اور پر کیف ماحول ہے۔

تشریح بند (۷)

شاعر اپنے گزرے ہوئے رنگین ماضی کو یاد کرتے ہوئے آنے والے ہم وطن سے اپنے وطن کے بارے میں دریافت کر رہا ہے کہ ذرا مجھ کو بتاؤ کہ جیسے حسن و عشق کی باتیں ہوا کرتی تھیں، رات رات بھر حسن اور عشق کی اور پیار بھرے گیتوں کی باتیں ہوا کرتی تھیں کیا اب بھی وہاں پر ویسا ہی ماحول ہے مجھے بتاؤ کہ میرے دل کو سکون حاصل ہو۔

تشریح بند (۸)

شاعر کہہ رہا ہے کہ مجھے بتاؤ کہ کیا ٹونک شہر کا بازار ابھی بھی ویسا ہی آباد ہے جب کہ ویرانی کے آغوش میں رہتا تھا یعنی آمد و رفت کم رہا کرتی تھی لیکن اس بازار کی آبادی رنگیلے، وضع دار نوجوانوں سے تھی اور اس کے علاوہ تانگہ گاڑیوں کے پردے کی اوٹ

سے معشوق بھی جھانکتے ہیں کہ نہیں کیا پہلے جیسا رنگین ماحول اس بازار کا آج بھی ہے کہ نہیں ذرا مجھے بتاؤ۔

تشریح بند(۹)

ایک غریب الوطن شاعر کو اپنے وطن کے مقدس مقامات سے کتنا لگاؤ ہوتا ہے اس کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ بتاؤ میرے پیارے وطن میں اب بھی مندر (ٹونک ریاست کا مشہور پورنا کا مندر) میں گھنٹوں کی آوازیں گونجتی ہیں کہ نہیں، اسی کے ساتھ ساتھ ٹونک کی شاہی جامع مسجد کے بلند و بالا میناروں سے اذان کی آوازیں دور تک سنائی دیتی ہیں کہ نہیں، جب شام ہو جاتی ہے تو پھر وہاں پر کیا اب بھی ویسے ہی عظمت اور بزرگی ماحول میں رہتی ہے کہ نہیں جیسی کہ ہمارے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔

تشریح بند(۱۰)

اس بند میں شاعر اپنے دیش کے پنگھٹ کے رنگین نظاروں کو یاد کرتے ہوئے پوچھ رہے ہیں کہ کیا اب بھی وہاں پر پنگھٹ کے نظارے اتنے ہی رنگین اور خوبصورت ہیں کہ وہاں پر پنہاریاں اب بھی پانی بھرنے کو جاتی ہیں اور جب وہ گاگر بھر کر ماتھے پر رکھتی ہیں تو وہ انگڑائی کے مختلف انداز سے رکھتی ہیں پھر وہ ہنسی مذاق اور دل لگی کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو نکل جاتی ہیں کیا وہاں پر اب بھی اتنا ہی رنگین ماحول ہے جیسا کہ پہلے ہوا کرتا تھا۔

تشریح بند(۱۱)

شاعر اختر شیرانی اپنے وطن ٹونک کے موسم کے بارے میں نوارد سے معلوم کرتے ہیں کہ کیا اب بھی میرے وطن میں برسات کا موسم ویسا ہی سہانا ہوتا ہے اور ساون کے جھولے ابھی بھی باغوں میں پڑتے ہیں کہ نہیں، اور ان جھولوں پر جھولنے والیاں جب آتی ہیں تو نوعمر لڑکے ان کو دیکھ کر دیوانے ہوا کرتے تھے کیا اب بھی وہاں پر ایسا ہی ہوتا ہے کیا وہاں کا موسم اب بھی ویسا ہی دلکش اور حسین ہے۔

تشریح بند(۱۲)

ایک عزیز ہم وطن سے شاعر پردیس میں پوچھ رہا ہے کہ مجھے بتاؤ کہ اپنے وطن میں پہاڑیوں کی چوٹیوں پر برسات کا موسم کیسا ہوتا ہے ٹھنڈی پھوار بھری ہواؤں کے جھونکے اب بھی چلتے ہیں کہ نہیں اس طرح کے دلفریب اور دلکش موسم میں لوگ رسیا (ٹونک کی مشہور چھتری) کی اونچی ٹیکری پر جا جا کر خوشیوں کی ترانے گاے بھی ہیں یا نہیں یعنی اب بھی وہاں کا موسم اور لوگوں کی وہی عادت ہے کہ نہیں ذرا مجھے بتاؤ۔

تشریح بند(۱۳)

اختر شیرانی اپنے ہم وطن نوارد سے اپنے وطن کے حالات معلوم کر رہے ہیں کہ مجھے بتاؤ کیا وہاں کا برسات کا موسم اب کس طرح کا ہے کیا اب بھی وہاں کی پہاڑیوں کی گھاٹیوں پر، ساحل کے گھنے درختوں میں گھنگھور کالی گھٹائیں آتی ہیں کہ

نہیں اوراس برسات کے موسم میں جب چاروں طرف برکھا کی ہوائیں چل رہی ہوں تو اس وقت جھینگر اور مور بھی اپنی خوشی کا اظہار پہلے کی طرح کرتے ہیں کہ نہیں کیا اب بھی وہاں پر خوشی کا ایسا ماحول اور موسم ہوتا ہے۔

تشریح بند (۱۴)

اپنے وطن کے برسات کے موسم کے تعلق سے شاعر اپنے ہم وطن سے دریافت کر رہے ہیں کہ کیا اب بھی بناس ندی کے کنارے پر نوگزے کے مزار پر اسی طرح کا میلہ اور ہجوم ہوتا ہے اور ایسے موسم میں کیا بڑ (برگد) کی پھیلی ہوئی شاخوں پر ساون کے جھولے پڑتے ہیں جب کہ چاروں طرف ساون کی گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہوتی ہیں کیا آج بھی وہاں ایسا ہی حسین سماں ہوتا ہے۔

تشریح بند (۱۵)

شاعر اپنے شہر ٹونک کے تین اطراف میں بہنے والے دریا بناس کی خوبصورتی کے تعلق سے پوچھ رہے ہیں کہ کیا میرے پیارے شہر میں اب بھی وہ خوبصورت دریا بہتا ہے کہ نہیں جو کہ شہر کے تین طرف اس طرح سے بہتا ہے کہ جیسے کوئی ناگن اپنی گود میں اپنے من (مہرہ) کو لیے ہوئے ہو یا پھر حور کی گردن میں چمکتی ہوئی ہنسلی ہو یعنی کہ جس طرح سے گردن میں چمکتی ہوئی ہنسلی ہوتی ہے اسی طرح سے دریا بھی ٹونک کے گلے میں ایک ہنسلی کی مانند ہے جو کہ چاندنی میں چمکتا ہے۔ کیا اب بھی وہاں پر ایسا ہی سماں ہوتا ہے مجھے بتاؤ۔

تشریح بند (۱۶)

شاعر اپنے ہم وطن سے اپنے وطن کے بارے میں پوچھ رہے ہیں کہ اب وہاں کا موسم کیسا ہے؟ کیا اب بھی وہاں کی فضا برسات کے موسم میں حسین اور خوش نما ہوتی ہے؟ کی برساتی موسم میں چلنے والی تیز ہواؤں سے دریا میں جوش اور طوفان کا سماں رہتا ہے کہ نہیں اور جب دریا اپھان پر ہوتا تو ملاح ان اندھیری راتوں میں خوشی کے گیت گاتے ہیں یا نہیں ذرا مجھ کو اس کے بارے میں بتاؤ۔

تشریح بند (۱۷)

اے میرے عزیز ہم وطن ذرا مجھ کو بتاؤ کہ ہمارے وطن عزیز کے برسات کے موسم میں باغوں میں بہاروں کا موسم ہوتا ہے ؟ کیا جہاں پر معصوم اور خوبصورت دوشیزائیں تیتیریوں کی طرح سے جھولے ڈال کر خوشی سے برکھارت کے ترانے گاتی ہیں کہ نہیں ذرا مجھ کو بتائیں۔

تشریح بند (۱۸)

اس بند میں شاعر اپنے نوارد سے پوچھتا ہے کہ کیا اب بھی وہاں پر دور افق پر گھٹاؤں کا بسیرا ہوتا ہے جس کی وجہ سے دریا کے کنارے باغوں میں بھی برساتی ہوا سے باغوں کے درخت اور ان نشیلی اور پر کیف ہواؤں سے فضا بھی جھومتی ہے

کیا ایسا اب بھی ہوتا ہے میرے وطن سے آنے والے دوست مجھے بتاؤ۔

تشریح بند(۱۹)

شاعر اپنے دیس کی رنگین شاموں کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہمارے وقت میں ملک کی شامیں جو رنگین ہوا کرتی تھیں کیا اب بھی ویسا ہی ماحول اور سماں رہتا ہے؟ کیا شام کے وقت اب بھی دوست احباب دریا کے کنارے گھومنے کے لیے جاتے ہیں اور دریا کے کنارے کیا اب بھی اتنے ہی گھنے درخت موجود ہیں، دریا کے صاف شفاف پانی میں کیا اب بھی ماہتاب (چاند) اس رنگین فضا میں اپنا عکس دکھاتا ہے، اب بھی ایسا ہی ہوتا ہے کیا؟ مجھے اس کی خبر دو۔

تشریح بند(۲۰)

اے میرے نوارد وطن ذرا مجھ کو وطن کے آموں کے باغات میں ان پپیہوں کے بارے میں بتاؤ جو کہ وہاں پر اپنی سریلی آواز سے نغمے گاتے ہیں اور ان نغموں سے جو کہ بڑے رسیلے ہوتے تھے وطن کے تالاب کے اس باندھ پر جہاں پر ساون بھادو کے میلے لگتے تھے ان میلوں میں وہ پیار کا امرت اب بھی گھولتے ہیں جنکی وجہ سے وہاں کا موسم اور بھی سہانا ہوتا ہے۔

تشریح بند(۲۱)

اس بند میں شاعر اپنے بیتے ہوئے بچپن کو یاد کرتے ہوئے اپنے ہم وطن سے دریافت کر رہے ہیں کہ کیا وہ مدرسہ کی معصوم فضا ابھی بھی ہے جس میں ہم نے اپنا بچپن گزارا تھا وہ گزرے ہوئے دن اب خواب کی طرح ہیں وہ کھیل وہ تمام بچپن کے ساتھی تمام کے تمام اب خواب گاہ کے چمکتے ہوئے چاند کی مانند ہیں کیا ایسی معصوم اور شاداب فضا ابھی بھی باقی ہے۔

تشریح بند(۲۲)

اپنے بچپن کے ساتھیوں اور زمانے کو یاد کرتے ہوئے پردیس میں اپنے ہم وطن سے معلوم کر رہے ہیں کہ مجھے بتاؤ کہ کیا بچپن کے ساتھیوں میں سے کوئی ہم کو یاد بھی کرتا ہے کہ نہیں؟ کسی کے دل میں ہماری چاہ بھی ابھی باقی ہے کہ نہیں یا ہم کو سب بھول گئے خدا کے لیے مجھے اس کے بارے میں میں بتاؤ۔

تشریح بند(۲۳)

اس بند میں شاعر اپنے وطن سے دور پردیس میں اس احساس کا اظہار کرتے ہیں کہ آج ہم اپنے وطن سے دور ہیں تو جس طرح سے ہم اپنے وطن کے موسم، ماحول اور حالات کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ کیا ہمارے وطن کے باغوں مین اب بھی مستانہ فضائین اور برکھا کی بہاریں، ساون کی گھٹائیں بھی ہم کو یاد کرتی ہیں کہ نہیں؟ جنگل میں دریا کے کنارے جب ہم جایا کرتے تھے تو کیا وہ دریا کے کنارے اور جنگل کی ہوائیں ہم کو یاد بھی کرتی ہیں کہ نہیں ہمارا تو بے چینی سے ب یہ حال ہے۔ کیا ادھر بھی ایسا ہی حال ہے اے میرے ہم وطن مجھ کو بتاؤ۔

تشریح بند(۲۴)

اپنے گاؤں کی رنگین اور مستی بھری راتوں کو یاد کرتے ہوئے شاعر آنے والے نوارد سے معلوم کر رہے ہیں کہ کیا گاؤں میں اب بھی ویسی ہی چاندنی اور مستی بھری راتیں ہوتی ہیں؟ جن کے اندر چاندنی میں گاؤں کی کم سن اور خوبصورت دوشیزائیں تالاب کے کنارے جا کر خوبصورت اور پیار بھر ترانے گاتی ہیں مجھے بتاؤ۔

تشریح بند(۲۵)

شاعر معلوم کر رہے ہیں کہ اے میرے وطن سے آنے والے مجھے بتاؤ کہ کیا آج بھی وہاں پر چرواہے اپنے ریوڑ کو چرانے کے لئے صبح صادق کو جلدی ہی نکل کر شام ڈھلے واپس آتے ہیں؟ اس دوران وہ اپنے وقت کو بتانے کے لیے جانوروں کے درمیان رہ کر اپنی بانسری سے پیار بھرے عشق کے نغمے گاتے ہیں یا نہیں؟ کیا ویسا ہی ماحول ابھی بھی ہے۔

تشریح بند(۲۶)

گڈریوں کے ریوڑ اور انکی بانسریوں کے گیت کے ساتھ ساتھ وہ ٹونک شہر سے قریب ایک گاؤں میں بھانچی کے بارے میں معلوم کر رہے ہیں کہ کیا اب بھی وہاں پر ساون موسم میں برکھا کی جب بہار ہوتی ہے اور اس وقت گاؤں کے کچے پکے گھروں میں صبح سویرے ہی چکی کے چلنے کی آوازیں اور اپنے میکے میں بچھڑی ہوئی سکھیوں کو یاد کر کے گانے کی آوازیں کیا آج بھی ویسے ہی آتی ہیں جیسے کہ ہمارے زمانے میں آیا کرتی تھیں۔

تشریح بند(۲۷)

شہر ٹونک میں بہنے والے دریا بناس کے کنارے پر بنے ہوئے ککراج کا گھاٹ، جہاں پر باغ، بنگلہ، اور تالاب وغیرہ بنے ہوئے ہیں ان کو یاد کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ اس ککراج کے گھاٹ کا کیا حال ہے؟ اس کی عمارتوں پر اب بھی وہی رونق ہے کہ نہیں؟ اس کے علاوہ گاؤں کے کھیت کھلیان اور ان میں چڑیوں کی چہچہاہٹ کی آج بھی باقی ہے۔

تشریح بند(۲۸)

اپنے وطن کے پرانے کھنڈرات جو کہ تاریخی حیثیت رکھتے ہیں، جن میں ان پورنا کا مندر، چھاؤنی محلّہ وغیرہ، ان پر آج بھی ویسی ہی مایوسی اور حسرت اور ویرانی اور رقت کا سا ماحول رہتا ہے جن سے تاریخی عبرت حاصل ہو۔ کیا اب بھی وہاں پر ایسا ہی ویرانی بھرا ماحول ہے۔

تشریح بند(۲۹)

اپنے ہم وطن سے اپنے وطن کے بارے میں سارے حالات معلوم کرنے کے بعد شاعر اپنی حسرت کا اظہار کر کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ ہماری معشوقہ جو کہ لوگوں کے ایمان کو تباہ کرتی تھی وہ اب کیسی ہے؟ جس کے حسن کے چرچے ہر طرف تھے

اور زمانہ اس آفت سے بڑا پریشان تھا ہم دونوں بھی اس شمع کے پروانے تھے تو ذرا مجھ کو بتاؤ کہ وہ اب کس حال میں ہے؟

تشریح بند (۳۰)

شاعر اختر شیرانی اپنے وطن میں مشہور جوان اور دلکش حسینہ جس کا نام مرجانہ تھا کے بارے میں پوچھ رہے ہیں کہ وہ پھول چہرے والی حسینہ جس پر پیرو جوان سب کے سب فدا تھے ،جس کی خوبصورتی پر چمن کا سرو کا درخت اور وطن رشک کیا کرتے تھے اب وہ کس حال میں ہے؟ میرے وطن سے آنے والے عزیز مجھے اس کے بارے میں بتاؤ کہ وہ اب کس حال میں ہے؟۔

تشریح بند (۳۱)

شاعر اپنے وطن کو چھوڑنے سے قبل اپنی معشوقہ کو جس حال میں چھوڑ کر گئے تھے وہ اس کے بارے میں جاننے کی کوشش میں ہیں کہ مجھے بتاؤ کہ ہماری جو معشوقہ تھی اس کے چہرے پر وہی جاذبیت اور کشش باقی ہے کہ نہیں؟ اس کی رسیلی آنکھوں اور گلابی ہونٹوں پر وہ بجلی کے شرارے باقی ہیں کہ نہیں؟ جن کی وجہ سے لوگ اپنا سب کچھ بھول جایا کرتے تھے، کیا اب بھی اس کے اندر اتنی ہی جاذبیت اور کشش باقی ہے کہ نہیں ذرا مجھ کو اس کے بارے میں بتاؤ۔

تشریح بند (۳۲)

شاعر اپنی محبوبہ کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں اور یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس کے سرخ گالوں پر کالے گیسو کیا اب بھی بل کھاتے ہیں ،اس کے چہرے کی سرخی پر دو کالی زلفیں بالکل کالے ناگ کی طرح سے لہراتی ہیں کیا ایسا اب بھی ہوتا ہے۔ اے میرے ہم وطن ذرا مجھ کو بتاؤ ان کالی زلفوں کی جھلک سے ساون میں راتوں کے سپنے (خواب) آتے ہیں؟ یعنی کہ جس طرح سے ساون کی کالی گھٹا اور رات اندھیری ہوتی ہے کیا اس کی زلفوں سے بھی ایسا ہی ہوتا ہے کیا؟۔

تشریح بند (۳۳)

شاعر اپنی محبوبہ کے متعلق معلوم کر رہے ہیں کہ وہ اس وقت چھوٹی تھی اب تو وہ جوان ہوگئی ہوگی اور شادی کے بھی لائق ہوگئی ہوگی تو وہ اب کہاں پر ہے میکے میں یا پھر اپنے سسرال میں وہ جس طرح سے اپنی کم عمری میں خوش حال تھی کیا وہ اسی خوش حالی میں اپنے سسرال گئی ہے کہ نہیں مجھے بتاؤ؟

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ اختر شیرانی کب اور کہاں پر پیدا ہوئے تھے؟
۲۔ اختر شیرانی کی مشہور نظموں کے نام لکھیں؟
۳۔ اختر شیرانی کے شعری مجموعے کون کون سے ہیں؟

14.7 عمومی جائزہ

مضامین حسن وعشق کو اردو میں ہمیشہ سے بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔اور رومانیت ایک جذبے اور طرز فکر کا نام ہے ۔اور اختر شیرانی وہ شاعر ہیں جنھوں نے صنف نازک کو اس کی تمام دل کشی اور دل آویزی کے ساتھ اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے، وہ صرف رومان کے شاعر ہیں، ان کی نظموں میں ہر جگہ کوئی نہ کوئی حسین جلوہ گر نظر آتا ہے۔

ان کی نظموں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اختر کی محبت افلاطونی انداز کی ہے، گوشت پوست کا ایک مادی پیکر رکھنے کے باوجود عورت ایک تخیلی سراپا ہی نظر آتی ہے، ان کی نظموں میں حسن پرستی کے ساتھ ساتھ حسن کاری اور حسن آفرینی کا بھی احساس ملتا ہے؛ او دیس سے آنے والے بتا؛ ان کی شہرہ آفاق وطنی نظموں میں سے ہے۔ان کے جذبات وطنیت کے ترجمان ہیں یہ نظم اردو کے منظوم لٹریچر میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے جس کے اندر بڑی ہی نازک خیالی شاعر نے پیش کی ہے۔اس اعتبار سے اختر شیرانی اردو کے ایک منفرد وممتاز نظم نگار شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔

14.8 نمونہ برائے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوال کے جواب تیس سطروں میں (۳۰) دیں

۱۔ اختر شیرانی کی حیات اور ان کی شعری خدمات پر ایک مختصر نوٹ لکھیں؟

ذیل کے سوالات کے جواب پندرہ (۱۵) سطروں میں دیں

۱۔ اختر شیرانی کی نظم او دیس سے آنے والے بتا کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں؟

۲۔ حسب ذیل بند کی تشریح کریں؟

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی سرمست نظارے ہوتے ہیں
کیا اب بھی سہانی راتوں کو وہ چاند ستارے ہوتے ہیں
ہم کھیل جو کھیلا کرتے تھے کیا اب بھی وہ سارے ہوتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا
کیا ہم کو وطن کے باغوں میں مستانہ فضائیں بھول گئیں
برکھا کی بہاریں بھول گئیں ساون کی گھٹائیں بھول گئیں
دریا کے کنارے بھول گئے جنگل کی ہوائیں بھول گئیں
او دیس سے آنے والے بتا

14.9 فرہنگ

کنعان	حضرت یوسف کی پیدائش کی جگہ	آوارہ غربت	پردیس، غریب الوطن
کنعان وطن	مراد ٹونک شہر (شاعر کا آبائی وطن)	فردوس وطن	جنت جیسا وطن
گھنگھور	گہرایا ہوا	سرمست	متوالا نشے میں چور
شفق	غروب آفتاب کے بعد ظاہر ہونے والی سرخی، خوش رنگ، اچھا اور چٹکیلا رنگ		
شگوفے	بغیر کھلے ہوئے پھول	شاداب	سرسبز ہرا بھرا
شگفتہ	کھلا ہوا	معمور	آباد بھرا ہوا
گلزار	چمن گلشن	نوخیز	نوجوان
بہیلی	تانگہ گاڑی	ملاح	ناؤ چلانے والا
دوشیزہ	کنواری	مخمور	نشے میں چور مست
افق	آسمان کا کنارہ آسمان کا زمین سے ملا ہوا نظر آنے والا حصہ		
معصوم	بے قصور	احباب	دوست
مہتاب	چاند	حریر	ریشم
ہم سن	ہم عمر	کم سن	کم عمر
ماہ وش	چاند کے جیسے	عبرت	نصیحت
مقدس	پاک	حسرت	کسی چیز کے نہ ملنے کا افسوس
رقت	رونا آنا	غارت	مٹانا، برباد کرنا
طفلان وطن	وطن کے بچے	سمن	چنبیلی
سیم	چاندی	شرارے	آگ کی چنگاری
شہابی	سرخ رنگ کے	عارض	گال، رخسار
گیسو	لمبے بال جو دونوں طرف ہوتے ہیں، زلف		
سیہ	کالے	ناقوس	سنکھ

14.10 معاون کتب

۱۔ تاریخ ادب اردو — پروفیسر نورالحسن نقوی

۲۔ مختصر اردو لغت — قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

۳۔ انتخاب نثر و نظم — ڈاکٹر فریدہ بانو

اکائی 15 رباعی: تعارف اور صنفی خصوصیات

اکائی کے اہم اجزا

15.1 اغراض ومقاصد

15.2 تمہید

15.3 رباعی کی تعریف

15.4 رباعی کی صنفی خصوصیات

15.5 رباعی کے موضوعات

15.6 رباعی کی اقسام

15.7 اردو میں رباعی کی روایت

15.8 خلاصہ

15.9 نمونہ برائے امتحانی سوالات

15.10 فرہنگ

15.11 معاون کتب

15.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ رباعی کی تعریف بیان کر سکیں۔

☆ رباعی کے صنفی تقاضوں پر اظہار خیال کر سکیں۔

☆ رباعی کے موضوعات پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ رباعی کی اقسام بیان کر سکیں۔

☆ اردو میں رباعی کی روایت پیش کر سکیں۔

☆ اپنی پسند کی چند رباعیوں کو ذہن نشین کرا سکیں۔

15.2 تمہید

رباعی اردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے جو اگر چہ مشکل مانی جاتی ہے لیکن اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں کوئی

شبہ نہیں ہے۔اس کی مقبولیت میں اس کی ہئیت اور موضوعات دونوں کا دخل ہے۔

اس اکائی میں اردو رباعی کی تعریف پر روشنی ڈالی جائے گی۔رباعی نگاری کے فنی وصنفی تقاضے ،مثلاً عروضی ہئیت ، اوزان اور زبان وطرز ادا یا اسلوب پر اظہار خیال کیا جائے گا۔

اس اکائی میں رباعی کا دیگر اصنافِ سخن سے تقابل کیا جائے گا۔اس کے علاوہ رباعی کی اقسام اور اردو میں رباعی گوئی کی روایت اور تدریجی ارتقا کا جائزہ بھی لیا جائے گا۔

15.3 رباعی کی تعریف

اردو شاعری کی ہئیتی اصناف میں مصرعوں کی تعداد کے اعتبار سے رباعی ایک مختصر صنفِ سخن ہے۔اگر چہ اس کی اصل ایرانی ہے لیکن رباعی کی اصطلاح عربی لفظ ''ربع'' سے بنی ہے جس کے معنی ہیں ''چار''۔رباعی شاعرانہ اصطلاح میں اس صنف کا نام ہے جو صرف چار مصرعوں یا دو بیتوں پر مبنی ہوتی ہے۔ان چار مصرعوں میں فکر وخیال کے لحاظ سے ،ایک مکمل مضمون ادا کیا جاتا ہے۔ رباعی کا پہلا ،دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔تیسرے مصرع میں قافیہ نہیں ہوتا اور اگر قافیہ لایا جائے تو کوئی عیب نہیں۔ابتدائی دور میں اسے ''ترانہ'' کہا جاتا تھا۔چوں کہ یہ ایک مطلع اور ایک بیت پر مشتمل ہوتی ہے۔اس لیے اس کو ''دوبیتی'' بھی کہا گیا ہے۔لیکن ''ترانہ'' اور ''دوبیتی'' رباعی کے موجودہ اوزان میں نہیں کہے جاتے تھے۔رباعی ایک خاص وزن سے منسوب ہوگئی ہے۔

15.4 رباعی کی صنفی خصوصیات

اصنافِ شعر میں رباعی اس ہئیتی نظم کو کہا جاتا ہے جو مختصر ہو اور محض چار مصرعوں پر مشتمل ہو۔رباعی کا پہلا ،دوسرا اور چوتھا مصرع مقفیٰ (ہم قافیہ) ہوتا ہے اور تیسرا مصرع غیر مقفیٰ (بے قافیہ) ہوتا ہے۔لیکن اس مصرع میں بھی قافیہ لانا جائز ہے۔

اگر کسی رباعی کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں تو ایسی رباعی کو رباعی 'غیر خصّی' یا 'مصرع' کہا جاتا ہے اور اگر رباعی کے صرف تین مصرعے اول، دوم اور چہارم ہم قافیہ ہوں اور تیسرے مصرع میں قافیہ نہ ہو تو رباعی 'خصّی' یا 'ناقص' یا 'غیر مصرع' کہیں گے۔

صنف رباعی مخصوص اوزان میں لکھی جاتی ہے۔یہ صنف ہر حال میں مقررہ عروضی نظام ہی کی پابند رہتی ہے۔ماہرینِ علمِ عروض نے رباعی کے لیے ان اوزان کی پابندی کو لازمی قرار دیا ہے۔اس صنف کی ہئیتی شناخت ان مخصوص اوزان میں مضمر ہے۔ اہل عروض اس بات پر متفق ہیں کہ ان مخصوص اوزان سے ہٹ کر لکھی ہوئی چومصرعی نظموں کو رباعی نہیں کہا جاسکتا۔عروضیوں نے رباعی کے چوبیس (۲۴) اوزان معین کر دیے ہیں جن کا تعلق بحر ہزج سے ہے۔علمائے علم عروض نے دوسرا اہم نکتہ یہ بھی پیش کیا ہے کہ رباعی میں اس کا التزام رکھنا رباعی گو کے لیے ضروری نہیں کہ رباعی کے چاروں مصرعے ان چوبیس اوزان میں سے صرف کسی ایک ہی وزن میں ہوں۔بلکہ اس میں یہ چھوٹ دی ہے کہ رباعی کے چار مصرعے، چار مختلف اوزان میں لکھے جاسکتے ہیں اس کے باوجود بہت کم رباعی نگار ہیں جنھوں نے اس آزادی کا بھرپور استعمال کیا ہے۔عموماً چند مخصوص اوزان ہی میں رباعیاں لکھی گئی ہیں۔یہ خیال درست نہیں ہے کہ رباعی کا وزن صرف 'لاحول ولاقوۃ الا باللہ' ہی ہے۔رباعی کے چوبیس اوزان میں سے

ایک وزن یہ بھی ہے اور رباعی کے بعض مصرعے اس وزن پر ہو سکتے ہیں۔

رباعی کے موضوعات کا کوئی تعین نہیں۔ فارسی اور اردو کے شعرا نے اس میں ہر قسم کے افکار و خیالات کو نظم کیا ہے۔ لہٰذا رباعی اپنے موضوع کے سبب سے نہیں، اپنی ہئیت کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔ اسی لیے اردو کی ہئیتی اصناف میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

رباعی کا کینوس بہت مختصر ہوتا ہے۔ دیگر اصناف سخن کے برخلاف رباعی کا ہر مصرع، اپنے خاص مطالبات اور فنی تقاضے رکھتا ہے۔ رباعی کا ہر مصرع شاعر کی مکمل توجہ اور دلچسپی چاہتا ہے۔ اس صنف سخن میں فن کے تقاضوں سے تھوڑی سی روگردانی کی بھی اجازت نہیں ہے۔ رباعی میں مصرعوں کی نوک پلک درست کرنا اور خیال کی تدریجی نشو ونما اور اس کے ارتقائی مدارج پر نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

رباعی میں کسی بھی موضوع یا مضمون یا اپنے مافی الضمیر کو عروض اور فنی پابندیوں کے ساتھ اس انداز سے بیان کیا جاتا ہے کہ چار مصرعوں میں خیال کی ابتدا اس کا پھیلاؤ اور اختتام سب کچھ سما جائے اور پھر ردیف وقوافی کی ساری بندشوں کا بھی خیال رکھا جائے، یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ چاروں مصرعوں میں نزاکت اور جذبے کی لطافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے چاروں مصرعوں میں ایسی ترتیب پیدا کرنا کہ ایک ارتقائی تاثر پیدا کر سکے خاصہ مشکل ہے۔ رباعی کے ابتدائی دو مصرعے معنی خیز ہوتے ہیں اور سخن سرا کی نکتہ سنجی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ رباعی کے آخری دو مصرعے بالخصوص چوتھا مصرع یعنی آخری مصرع پوری رباعی کے مجموعی تاثر کا نقطۂ عروج ہوتا ہے۔ اس پر رباعی کے حسن واثر اور زور کا انحصار ہے۔ اگر چہ یہ ضروری نہیں ہے لیکن عموماً تیسرا مصرع عروضی ہئیت میں باقی مصرعوں سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ یہ دراصل نقطۂ عروج کی ابتدا ہے یہ خیال کے بہاؤ میں ایک لمحاتی رکاوٹ اور موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موڑ سے عروج شروع ہو کر چوتھے مصرع پر اپنی آخری حد کو پہنچتا ہے۔

رباعی کا چوتھا مصرع خاص کر پہلے تینوں مصرعوں سے زیادہ شاندار اور اہم ہوتا ہے کیوں کہ اس مصرع پر شاعر کے خیال کی تان ٹوٹتی ہے۔ یہ مصرع نہ صرف ابتدائی مصرعوں کا خلاصہ یا نچوڑ ہوتا ہے بلکہ رباعی کی اصل جان ہوتا ہے۔ اس لیے یہ مصرع اپنی پوری معنویت کے ساتھ پر اثر ہوتا ہے۔ شاعر رباعی میں جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ ایجاز واختصار اور حکیمانہ لہجے کے ساتھ چوتھے مصرع ہی میں پیش کرتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ شاعر نے چوتھے مصرع میں جو دعویٰ کیا ہے اس کا شاعرانہ استدلال ابتدائی تین مصرعوں میں ہوتا ہے۔ ان تمام قیود کے ساتھ ساتھ رباعی کے چاروں مصرعے باہم دست وگریبان ہوتے ہیں۔ بالخصوص چوتھے مصرع میں روانی، برجستگی، اثر وسلاست اتنی ہونی چاہیے کہ متکلم کی زبان سے نکلتے ہی سامعین کے دل میں اتر جائے۔ مفہوم کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو اور ان کے دماغ میں اس کی گونج دیر تک باقی رہے۔ اوپر بیان کی گئی خصوصیات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ذیل کی رباعی کو بغور پڑھیے۔

کیوں زر کی ہوس میں در بدر پھرتا ہے
جانا ہے تجھے کہاں کدھر پھرتا ہے
اللہ رے پیری میں ہوس دنیا کی
تھک جاتے ہیں جب پاؤں تو سر پھرتا ہے

(انیسؔ)

رباعی کے اجزا کی ترکیب وترتیب میں سلیقہ اور ذہانت ضروری ہے۔ رباعی دیگر اصنافِ سخن سے مختلف بھی ہے اور دشوار بھی۔ اس کی زبان اور طرز بیان پر قابو رکھا جاتا ہے، دراصل اس کا میدان تنگ دامنی کی شکایت کرتا ہے شاعر کو اپنا سارا بلند اور ادق مضمون چار مصرعوں میں ہی ادا کرنا ہوتا ہے۔ چار مصرعوں کی وجہ سے اس میں الفاظ کی تعداد بھی مختصر ہوتی ہے لیکن اسے اس مختصر ذخیرے میں ہی خیالات کی وسیع کائنات کو ملفوف کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے لیے فکر وتخیل کی دلآویزی، نظر وتجربے کی وسعت، فن وبیان کی پختگی، مشق سخن اور اظہار پر کمال قدرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس صنف میں طبع آزمائی وہی شاعر کرتے ہیں جو فکر وتصورات، الفاظ و اصطلاحات اور بیان پر عبور رکھتے ہیں۔ یہ صنف بظاہر تو بہت آسان معلوم ہوتی ہے مگر اس میں فنی نزاکتیں بہت زیادہ ہیں۔

رباعی گو مخصوص بحروں کے چار مصرعوں میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفاہیم اور ایک جہانِ معنی کو سمیٹ لیتا ہے۔ نہ اس میں غزل کا سا اختصار وایجاز ہے کہ محض کیفیت کے اظہار پر قناعت کرے یا صرف تاثر ہی کو ادا کرنے پر اکتفا کرے، نہ نظم کی سی وسعت ہے کہ کسی مقدمے کو منطقی ربط کے ساتھ بیان کرے۔ اس میں غزل کا ایجاز بھی ہوتا ہے اور نظم کا ربط وتسلسل بھی پایا جاتا ہے۔

بحر کے علاوہ مضامین وموضوعات کے اعتبار سے بھی یہ فن پیچیدہ ہے۔ دراصل رباعی کی تخلیق سنجیدہ مضامین کے لیے کی جاتی ہے۔ سنجیدہ مضامین بذاتِ خود مشکل اور بعض اوقات عام آدمی کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے اظہار کے لیے موزوں ومناسب الفاظ کا انتخاب نہایت ضروری ہے۔ فلسفہ کے بعض اہم مسائل اس بات کے متقاضی ہوتے ہیں کہ ان کو واضح طور پر پیش کرنے کے لیے مخصوص الفاظ واصطلاحات کا استعمال کیا جائے۔

رباعی کا پیرایہ اظہار بے حد موثر اور لطیف ہوتا ہے۔ اس صنف کا اثر وتاثر زبان و بیان میں مضمر ہے۔ جس طرح قصیدے کے لیے پرشکوہ اور شاندار الفاظ کی ضرورت ہے۔ اسی طرح غزل کے لیے نرم ونازک، سبک وشیریں، دلکش اور حسین الفاظ ومرکبات کی ضرورت ہے تاکہ مخاطب کے دل پر اس کا خاطر خواہ اثر ہو۔ لیکن ان اصناف سخن کے برخلاف رباعی فکریہ ہے جو چند خاص مضامین کے لیے مخصوص ہوگئی ہے۔ اس میں فکری عناصر خواہ نشاطیہ ہوں یا طربیہ دونوں میں زبان کی ملائمت اور سادگی وپرکاری درکار ہے۔

جہاں خیالات کا ترفع رباعی کی جان ہے۔ وہاں طرز بیان اور زبان کی سلاست بھی اس کی روح ہے، فلسفہ وتصوف، حکمت واخلاق کے مسائل دلکش ودلاویز پیرائے میں بیان کرنا اس کے لوازم میں شامل ہے۔ عشقیہ مضامین بھی اگر ہوں تو اس میں خاص انداز میں بیان کیے جاتے ہیں۔

رباعی کی زبان کے لیے چند لوازمات ضروری ہیں۔ رباعی کی بہتری وبرتری، حکمت، نصیحت، اخلاق، ادب، فلسفہ اور اسی طرح بعض مضامین وموضوعات کی خوش اسلوبی، دل فریبی، اختصار، بندش دل چسپ ترتیب چستی اور صفائی میں مضمر ہے۔ اس میں صنائع وبدائع کی کثرت نیز ثقیل اور مغلق الفاظ سے گریز کرنا چاہیے۔ ہاں اگر فطری انداز میں کوئی صنعت آجائے تو مضائقہ نہیں ہے۔ جب رباعی میں خاص لوازمات کو مہیا کیا جائے گا تو اس میں تصنع پیدا ہو جائے گا۔

خود جانچنے کے سوال

۱۔ اصناف شعر میں رباعی کس نظم کو کہا جاتا ہے؟

۲۔ صنف رباعی کے مخصوص اوزان کتنے ہیں اوران کا تعلق کس بحر سے ہے؟

۳۔ رباعی کا چوتھا مصرع کیسا ہونا چاہیے؟

15.5 رباعی کے موضوعات

رباعی کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔اس کے موضوعات میں فلسفہ،حکمت،توحید،شوخی، مدح وذم، پندونصائح، تصوف وعرفاں، مذہب، دعا، مناجات،نعت،منقبت،خمریات، رثا، اخلاق،تمدن اورعشق شامل ہیں۔اس کے علاوہ مختلف سیاسی وسماجی،تاریخی وثقافتی،شخصی وذاتی حالات، مسائل اورتصورات، ریختی اور منظرنگاری ونیز دیگر موضوعات بھی باندھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹرسلام سندیلوی لکھتے ہیں:

''رباعی کے عام موضوعات وہی ہیں جوتقریباً غزل کے ہیں۔غزل بھی داخلی جذبات کا آئینہ ہوتی ہے اوررباعی میں بھی قلبی واردات نظم کی جاتی ہیں۔اگرچہ رباعی غزل کے مقابلہ میں زیادہ سنجیدہ صنف سخن ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ رباعی کا تعلق ابتداہی سے فقرااورصوفیا حضرات سے رہا ہے۔اسی لیے فارسی رباعیات میں اخلاق وموعظت ،فقروفنا، پندونصائح اورترک دنیا وغیرہ مضامین پائے جاتے ہیں۔ چوں کہ اردو رباعی نے اپنا چراغ فارسی رباعی سے روشن کیا ہے۔اسی لیے اردو رباعی میں بھی انھیں موضوعات کی جھلکیاں موجود ہیں۔'' (ڈاکٹرسلام سندیلوی ص۶۹۴)

فارسی کے ذریعے اردو رباعی میں بھی یہی سارے موضوعات داخل ہوگئے۔یہ صنف ہندوستان کے ہر دور کی خصوصیات،تغیرات اورانقلابات کی سچی تصویر رہی ہے چنانچہ میرؔ،انیسؔ،حالیؔ،اکبرؔاور جوشؔ کی رباعیاں اپنے دور کے سماجی، معاشرتی اورسیاسی حالات کی آئینہ دار ہیں۔

عام موضوعات کے علاوہ ہر رباعی گو کا ایک مخصوص موضوع اورمخصوص رنگ ملتا ہے۔یہ موضوع اس کے ذاتی رجحان اورمیلان طبع کا ترجمان ہوتا ہے۔وہ اس موضوع میں اپنا مخصوص رنگ بھی بھرتا ہے۔یہ رنگ یا تو رباعی گو کی دروں بینی کا عکاس ہوتا ہے یا بیرون بینی کا ترجمان ہوتا ہے۔

ذیل میں چند موضوعاتی رباعیات درج کی گئی ہیں۔

(۱) فلسفیانہ

اتنے بھی ہم خراب ہوتے رہتے
کا ہے کو غم و الم سے روتے رہتے
سب خواب عدم سے چونکنے کے ہیں وبال
بہتر تھا یہی کہ وہ وہیں سوتے رہتے

(میرؔ)

(۲) حکیمانہ

زیبا ہے وقار بادشاہی کے لیے
جرأت واجب ہے کج کلاہی کے لیے
لازم ہے کہ ہو اہلِ سخن تیز زبان
تلوار ضرور ہے سپاہی کے لیے

(انیسؔ)

(۳) توحید

ہے ان کی جبیں اور بتوں کی درگاہ
ہیں شرکِ خفی میں مبتلا شام و پگاہ
کس کو یہ خیال ہے کہ مومن کے لیے
قران میں ہے اشدُّ حباً لِلہ

(اکبرؔالہ آبادی)

(۴) شوخی

سامان خورد و خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے، غالبؔ، لیکن
خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

(غالبؔ)

(۵) صوفیانہ/عارفانہ

بے خود رہوں تو وہ قریں آتا ہے
پردے ہی میں وہ پردہ نشیں آتا ہے
جب وہ ہوتا ہے میں نہیں ہوتا
میں جب ہوتا ہوں وہ نہیں آتا ہے

(امجدؔ)

(۶) مذہبی۔حمدیہ

تو ہی کہ جان تھا اور تو ہی دل تھا
تو ہی کہ جان تھا اور تو ہی دل تھا

تو ہی تھا وہ جس کو میں کہتا تھا میں ہوں
پر حیف کہ اس بھید سے میں غافل تھا

(قائمؔ)

(۷) مناجات

یارب میں ہوں بندۂ گہنگار ترا
دل میرا گناہ کی طرف سے تو پھرا
گر جرم نہ بخشے تو کدھر جاؤں میں
میں بندہ ترا ہوں تو خداوند مرا

(حسرتؔ دہلوی)

(۸) خمریہ

کل رات گئے مست تھی جب موجِ نسیم
شبنم میں نہا رہی تھی پھولوں کی شمیم
اک حور نے ساغر سے نکل کر یہ کہا
میں روح مئے ہوشربا ہوں تسلیم

(جوشؔ)

(۹) رثائیہ

کیا وحش و طیور وانس و جاں عالم میں
جو ہیں سوحسن روتے ہیں وہ اس غم میں
روشن نہ سمجھ ضریح پر قندیلیں
جلتے ہیں یہ دل حسین کے ماتم میں

(میرحسنؔ)

(۱۰) اخلاقی

ہے پیر مغاں سے مجھ کو غمگیں ارشاد
دشمن کی بھی دشمنی سے رہنا آزاد
اس کعبۂ دل میں خصومت ایسی
جیسے کہ حرم میں ہے کبیرہ الحاد

(غمگینؔ دہلوی)

(۱۱) عشقیہ

آرام نہ دل کو بے قراری کے سبب
نہ رات کو چین آہ و زاری کے سبب
واقف نہ تھے ہم تو ان بلاؤں سے کبھو
یہ کچھ دیکھا تو تیری یاری کے سبب

(دردؔ)

خود جانچنے کے سوال

۴۔ اردو رباعی میں کس طرح کے موضوعات پائے جاتے ہیں؟

15.6 رباعی کی اقسام

رباعی کو ہئیت کے اعتبار سے دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ رباعی خصّی اور رباعی غیر خصّی

(۱) رباعی خصّی

رباعی خصّی، رباعی کی ایسی قسم ہے جس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے اور تیسرا مصرع بے قافیہ۔ ''رباعی خصّی'' کو ''ناقص'' یا ''غیر مصرع'' بھی کہا جاتا ہے۔ ایسی رباعیوں میں تیسرا مصرع ایک جھٹکا سا پیدا کر دیتا ہے اور اس سے ذہن چونک پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے رباعی کے مجموعی تاثر میں اضافہ ہوتا ہے۔

اردو رباعیوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ''رباعی خصّی'' اردو میں زیادہ مقبول و معروف رہی ہے۔ لیکن رباعی کے ابتدائی دور میں ''غیر خصّی'' رباعی کہی جاتی تھی لیکن بعد کے شعرا نے اس طرز کو لازمی نہیں سمجھا اور تیسرے مصرع کو غیر مقفیٰ کر دیا۔ متاخرین نے اس طرز کو جائز مانا۔ عہد حاضر کے رباعی گو نے عموماً خصّی رباعی کو رواج دیا اور یہی رباعیوں نے قبول عام پایا۔

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں
پھر بھی اثر دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ، پڑھتے ہیں نماز
کرتے نہیں پرہیز، دوا کھاتے ہیں

(امجدؔ)

(۲) رباعی غیر خصّی

رباعی غیر خصّی، رباعی کی ایسی قسم ہے جس کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ یعنی رباعی کے تیسرے مصرع

میں بھی قافیہ ہوتا ہے۔ایسی رباعی کو''مربع''،''مقفیٰ''یا''مصرع'' بھی کہا جاتا ہے۔

ابتدائی دور کی رباعیوں میں عموماً چاروں مصرعوں میں قافیہ لانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔اس کے بعد کے شعرانے یہ التزام لازمی نہیں سمجھا۔اس دور کے رباعی گو کبھی چاروں مصرعوں میں قافیہ لاتے تھے اور کبھی مصرعِ سوم کو غیر مقفیٰ کر دیتے تھے۔رباعیوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں طرح کی رباعی نگاری جائز ہے۔مگر غیر خصّی طرز کی رباعیاں اردو ادب میں بہت کم ملتی ہیں۔مثلاً حالؔی کی رباعی میں چاروں مصرعے ہم قافیہ (مقفیٰ) ہیں:

آبا کو زمین و ملک پر اطمینان
اولاد کو سستی پہ قناعت کا گمان
بچے آوارہ اور بے کار جوان
ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہمان

(حالؔی)

خود جانچنے کے سوال

۵۔ خصّی رباعی کسے کہتے ہیں؟

۶۔ جس رباعی کے چار مصرعے ہم قافیہ ہو اس رباعی کو کیا کہتے ہیں؟

15.7 اردو میں رباعی کی روایت

محققین اس بات پر متفق ہیں کہ رباعی عربوں کی نہیں بلکہ ایرانیوں کی ایجاد ہے۔رباعی نے ایران میں جنم لیا تھا۔ ابتداً یہ صنف عام پسند ترانہ تھی۔اس قبول عام کی وجہ سے صوفیہ بھی اس صنف کی طرف متوجہ ہوئے اور ان میں مسائل تصوف نظم کرنے لگے۔رفتہ رفتہ نعت و منقبت بھی اس کے دامن میں سمٹ آئے۔اس کی شہرت سے متاثر ہو کر خواص بھی رباعی کی طرف متوجہ ہونے لگے اور درباری شعرانے بھی اسے اپنانا شروع کیا۔درباری شعرانے تاریخ، مدح، مفاخرت اور ہجو کے مضامین بھی رباعی میں شامل کیے۔اس تنوع مضامین کے باوجود رباعی کا آہنگ داخلی اور حکیمانہ ہے۔

رباعی کا ایک مخصوص وزن ہے۔رباعی کے لیے بحرِ ہزج میں چوبیس اوزان کا تعین کیا گیا تھا لیکن بعض ماہرین عروض کے مطابق ہندی چھندوں کے اعتبار سے اس میں بیاسی ہزار سے زائد اوزان ہو سکتے ہیں۔عام طور پر رباعی کا وزن 'لاحول ولاقوۃ الا باللہ' مقبول ہے علاوہ ازیں اس کے دوسرے اوزان بھی ہیں۔فارسی رباعیوں میں عشق و تصوف، اخلاق و مذہب، فلسفہ، رثائی، قلندری و سرمستی اور خمریات وغیرہ کے موضوعات ملتے ہیں۔فارسی رباعی کی ترقی میں فقرا اور صوفیا کا زبردست حصہ رہا ہے۔فارسی کے اہم رباعی گو شعرا میں ابوسعید ابوالخیر، عطار، مولانا روم، عمر خیام، سعدی، حافظ، جامی، افضل، کاشانی، سحابی، نجفی اور نظامی وغیرہ کی رباعیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہندوستان کے صوفی شعرا خسرو، بوعلی قلندر اور سرمد کے علاوہ غالب، اقبال، امجد، اور کئی دوسرے شعرانے فارسی میں رباعیاں کہی ہیں۔ہندوستانیوں نے ایرانی رباعی گویوں کے اتباع میں رباعیاں کہنا شروع کیں تو

انھوں نے فارسی ہی کے معتبر لہجے کو اپنایا۔

اردو میں دیگر اصناف سخن کی طرح صنف رباعی کے جنم کا فخر بھی دکن ہی کو حاصل ہے۔ دکنی شعرا نے بیشتر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی انھوں نے رباعی بھی لکھی لیکن اس کی طرف بہت کم توجہ کی۔ تعداد کی قلت کے باوجود حیرت کی بات ہے کہ دکنی رباعیوں میں جتنا تنوع اور جیسی بوقلمونی، رنگارنگی، وسعت اور ہمہ گیری نظر آتی ہے وہ بعد کے دور کی رباعیات میں کم دکھائی دیتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دکنی رباعی گو شعرا نے رباعی کے دامن کو بہت وسیع کیا اور اس کو ہر قسم کے تصورات و جذبات کے اظہار کے قابل بنایا۔ علاوہ ازیں موضوعات اور مضامین میں بھی خاصی وسعت اور ہمہ گیری موجود ہے۔ دکنی شعرا نے زندگی کی رنگارنگی اور تجربات و مشاہدات کو بڑی خوبی کے ساتھ رباعی میں سمو دیا ہے۔ ان کے یہاں فلسفیانہ، متصوفانہ، اخلاقی، مذہبی، مدحیہ، نعتیہ، منقبتی، رثائی، شبابیاتی، عاشقانہ، طنزیہ، خمریہ، ہر قسم کی رباعیات موجود ہیں۔ دکنی شعرا نے جیسی رسیلی، پر کیف اور رنگین شبابیاتی رباعیاں لکھی ہیں ان کی مثال اردو کے شعری ذخیرے میں بہت کم ملتی ہے۔ اس رنگ کی شروعات کا سہرا بھی دکنی شعرا ہی کے سر ہے۔ اگر چہ دکنی رباعی گو شعرا نے بہت ہی کم رباعیات کہی ہیں لیکن یہ کمی اس طرح پوری ہوگئی ہے کہ اکثر دکنی رباعیاں خیالات کی ترجمانی، جذبات کی عکاسی اور پیش کش کے حسن کے لحاظ سے بعد کے عہد کی رباعیات کی ہم پایہ ہیں اور اس طرح کمیت کی کمی کیفیت نے پوری کردی ہے۔

دکنی یا قدیم اردو کے اولین رباعی گو شاعر کی حیثیت سے خواجہ بندہ نواز کا نام سرفہرست ہے۔ اگر چہ ان کی تحریروں کے بارے میں محققین کی رائے یہ ہے کہ یہ تصانیف ان کے زمانے کے بعد کی تخلیق ہے جنھیں بندہ نواز کے نام سے موسوم کردیا گیا لیکن خواجہ بندہ نواز کی رباعی کے تعلق سے اس طرح کی کوئی بحث نہیں آئی ہے۔ دکنی کے رباعی گو شعرا میں فیروز شاہ بہمنی، محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، شاہی اور نصرتی کے علاوہ اور بھی کئی شعرا نے رباعیاں کہی ہیں۔ لیکن انھوں نے بھی اس صنف کو صرف ضمنی طور پر برتا ہے۔ ولی سے اردو کے ایک نئے دور کی ابتدا ہوتی ہے۔ ولی نے شمالی ہند میں اپنے کلام کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ اردو میں تخلیقی اظہار کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ ولی کی رباعیاں عموماً تغزل اور تصوف کا رنگ لیے ہوئے ہیں رثائیہ رباعیاں بھی انھوں نے لکھی ہیں۔ دکن میں ولی کے بعد داؤد، سراج، عزلت، عشق اور باقر آگاہ وغیرہ کئی شعرا نے رباعیاں لکھیں۔ آصفیہ دور میں شمالی ہند سے کئی شعرا حیدرآباد منتقل ہوئے انھوں نے بھی رباعی کے دامن کو اور وسیع کیا۔ ان شعرا میں داغ دہلوی، امیر مینائی، جلیل مانک پوری، نظم طباطبائی، سید امجد حسین، فانی بدایونی، یاس یگانہ چنگیزی وغیرہ کے نام قابل تحسین ہیں۔

شمالی ہند میں ابتدائی دور سے ہی رباعی گوئی کی ابتدا ہوچکی تھی۔ دہلی کے قدیم شعرا میں فائز، حاتم، آبرو، مضمون، قائم، بیان، محسن، تاباں اور سنتو کھ رائے بے تاب وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان شعرا نے رباعیات کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ان کے بعد رباعیات کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ ایسے رباعی گو شعرا جنھوں نے صنف رباعی پر خاص توجہ کی ان میں خواجہ میر درد، میر سوز، سودا، میر حسن، میر، حسرت دہلوی، غمگین دہلوی، نظیر اکبرآبادی، مصحفی، جرأت، انشاء، رنگین، ناسخ اور عبدالغفور نساخ وغیرہ کے نام اہم ہیں علاوہ ازیں ذوق، غالب، مومن نے بھی اپنے اپنے رنگ میں رباعیاں لکھیں لیکن ان کی رباعیاں اگر چہ ہر موضوع پر ہیں لیکن ان کی حیثیت ضمنی سے زیادہ نہیں ہے۔ تقریباً سب ہی مرثیہ گو شعرا نے بھی رباعیاں کہیں کیونکہ مرثیہ پیش کرنے سے قبل مجلس کو متوجہ کرنے کے لیے پہلے دو چار رباعیاں اور سلام پڑھے جاتے تھے، جس سے ہر مرثیہ گو کا رباعی کہنا ضروری سا ہوگیا

تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رباعیوں کا کافی ذخیرہ جمع ہو گیا۔ ایسے شعرا میں انیس، دبیر، عشق، اوج وغیرہ کے نام مشہور ہیں۔ ان مجالس کی وجہ سے صنف رباعی کی مقبولیت میں بہت اضافہ ہوا۔ انیس و دبیر نے خصوصیت کے ساتھ اہل بیت کی مدح میں رباعیاں کہیں، سانحۂ کربلا پر اظہار غم کیا پھر اخلاق و نصیحت کے مضامین پیش کیے۔ رباعی کے فروغ میں خاص طور پر میر انیس کی کوشش کو بڑا دخل ہے۔ ان کے مرثیوں کی طرح ان کی رباعیاں بھی بہت بلند پایہ ہیں۔ انیس کے بعد ان کی پیروی میں متعدد شعرا نے رباعیاں کہیں۔

پہلی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں میں بیداری کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی۔ سرسید کی تحریک نے مغربی تعلیم کی طرف نوجوانوں کو متوجہ کیا۔ محمد حسین آزاد نے شاعری میں مناظموں کے ذریعے ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ حالی اور دیگر شعرا نے رباعیوں کے ذریعے عوامی رائے کو ہموار کر کے درس اخلاق کا ایک اہم فریضہ انجام دیا۔ اردو رباعی گو شعرا نے اپنی رباعیوں میں طنز و مزاح سے سماجی اصلاح کا بھی کام لیا ان شعرا میں اکبر الہ آبادی کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے اصلاحی رباعیاں کہہ کر اس صنف کو مزید وسعت دی۔

جدید عہد میں بھی شعرا نے فنی و صنفی لوازم کی پاسداری کرتے ہوئے رباعیاں لکھی ہیں اور یہ سفر مسلسل جاری ہے۔ بیسویں صدی میں شاد، امیر مینائی، جگت موہن لال رواں، اقبال، امجد حیدر آبادی، عبدالباری آسی، یاس یگانہ چنگیزی، تلوک چند محروم، اثر لکھنوی، جگر، جوش، فراق، شفیق، مجنوں، ساغر، اثر صہبائی، ریاض خیر آبادی وغیرہ اہم ہیں۔

دور جدید میں رباعی کی ترقی کا یہ بھی ایک ثبوت ہے کہ جس طرح فارسی میں عمر خیام نے صرف رباعیاں کہی ہیں اور یہی رباعیاں ان کی حیات ابدی کی ضامن ہیں۔ اسی طرح اردو میں حضرت امجد حیدر آبادی نے بھی صرف رباعیاں کہی ہیں اور اگر انھوں نے کچھ نظمیں بھی لکھی ہیں تو زیادہ تر رباعی کی بحر میں ہی لکھی ہیں۔

اردو کے جدید شعرا نے رباعی گوئی کی طرف کم ہی توجہ کی۔ جن شعرا کے یہاں روایت کی پاسداری ہے ان کے ہاں کچھ رباعیاں مل جاتی ہیں۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ رباعی کا آہنگ دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں قدرے دشوار ہے۔ اور عروض پر مہارت کا بھی متقاضی ہے۔ عہد حاضر میں چند ایسے رباعی گو شعرا ہیں جنھوں نے جدید لب و لہجہ میں رباعیاں لکھی ہیں جیسے سید وحید اشرف، کوثر صدیقی، شمس الرحمٰن فاروقی، راہی فدائی، فرید پربتی اور علیم صبا نویدی وغیرہ۔

خود جانچنے کے سوال

۷۔ دکنی کے اولین رباعی گو شاعر کا نام بتائیے؟

۸۔ مرثیہ لکھنے والے شعرا میں کن شاعروں نے رباعی پر خاص توجہ کی؟

۹۔ حیدر آباد کے مشہور رباعی گو شاعر کا نام بتائیے؟

15.8 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے اردو کی ایک اہم شعری صنف رباعی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس سلسلے میں رباعی کی تعریف کی گئی پھر اس کی صنفی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی۔ اس کے بعد رباعی کے موضوعات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اور رباعی کی

اقسام کی وضاحت بھی کی گئی۔اس طرح رباعی اوراس کی صنفی خصوصیات کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کی گئیں۔

چوں کہ رباعی اردو شاعری کی اہم صنف سخن ہے اس لیے اردو ادب میں اس کے آغاز وارتقا کی روایت بھی پیش کی گئی۔طلبا کی سہولت کے لیے فرہنگ بھی دی گئی اور امتحانی سوالات کا نمونہ بھی پیش کیا گیا۔آخر میں مزید مطالعے کے لیے اس موضوع سے متعلق چند اہم کتابوں کی نشاندہی بھی کی گئی۔

15.9 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالات کے جوابات پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے۔

۱۔ رباعی کسے کہتے ہیں۔مثالوں کے ذریعہ اپنے الفاظ میں لکھیے؟

۲۔ رباعی کی اقسام پر اظہار خیال کیجیے؟

ذیل کے سوالات کے جوابات تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

۱۔ رباعی کی تعریف کرتے ہوئے اس کی صنفی خصوصیات قلمبند کیجیے؟

۲۔ اردو میں رباعی گوئی کے آغاز وارتقا پر مفصل نوٹ لکھیے؟

15.10 فرہنگ

عروض	:	وہ علم جس سے نظم کے قواعد معلوم ہوتے ہیں	ہیئت	:	شکل، بناوٹ، کیفیت
اسلوب	:	طریقہ،طرز	روایت	:	کسی بات کی نقل، اظہار
اوزان	:	وزن کی جمع،تولنے کے پیمانے	مضمر	:	پوشیدہ،مخفی
روگردانی	:	انحراف، نافرمانی	تدریجی	:	درجہ بدرجہ،آہستہ آہستہ
لطافت	:	عمدگی، باریکی،صفائی	معنی خیز	:	پُرمعنی
سخن سرا	:	شاعر،شعر کہنے والا	نکتہ سنجی	:	خوش بیانی
قدرے	:	تھوڑا	استدلال	:	دلیل،ثبوت
قیود	:	قید کی جمع، پابندیاں	متکلم	:	بات کرنے والا
طبع آزمائی	:	طبیعت کی آزمائش	ایجاز	:	مختصر کرنا
قناعت	:	جو مل جائے اس پر راضی رہنا	اکتفا	:	کافی سمجھنا
متقاضی	:	تقاضا کرنے والا	ادق	:	نہایت مشکل
ملفوف	:	لفافہ میں بند، بند	ملائمت	:	نرمی،نزاکت
ترفع	:	بلندی چاہنا	مغلق	:	مشکل

تنوع : مختلف رنگ کا ہونا

کج کلاہی : خودنمائی

برفاب : ٹھنڈا پانی

خصومت : دشمنی

مفاخرت : بڑائی،فخر

موعظت : پندونصیحت

پگاہ : صبح

ضریح : قبر

متاخرین : پیچھے آنے والے لوگ

پاسداری : لحاظ،خیال،ادب

15.11 معاون کتب

1۔ ترقی اردو بیورو،نئی دہلی درس بلاغت

2۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی اردو رباعیات

3۔ شمیم احمد اصناف سخن اور شعری ہیئتیں

اکائی 16 انتخابِ رباعیات: میر انیسؔ

اکائی کے اہم اجزا

16.1 اغراض ومقاصد

16.2 تمہید

16.3 میر انیسؔ: تعارف

16.4 میر انیسؔ کی رباعیوں کی خصوصیات

16.5 میر انیسؔ کی رباعیوں کا مطالعہ

16.6 خلاصہ

16.7 نمونہ برائے امتحانی سوالات

16.8 فرہنگ

16.9 معاون کتب

16.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

- ☆ میر انیس کے سوانحی حالات بیان کر سکیں۔
- ☆ میر انیس کی شاعری کے آغاز پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ میر انیس کی رباعیات کے موضوعات بیان کر سکیں۔
- ☆ میر انیس کی رباعیوں کی خصوصیات پر اظہار خیال کر سکیں۔
- ☆ درسی کتاب میں موجود میر انیس کی رباعیات کا مفہوم سمجھا سکیں۔

16.2 تمہید

پچھلی اکائی میں اردو اصناف سخن کی ایک اہم اور مختصر ہیئتی صنف رباعی کی تعریف، صنفی خصوصیات، اقسام اور رباعی گوئی کے آغاز وارتقا کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔

اس اکائی میں ہم اردو کے ایک اہم مقبول ومعروف شاعر میر انیسؔ اور ان کی رباعی گوئی کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

سب سے پہلے ہم انیس کا تعارف حاصل کریں گے پھر ان کی شاعری بالخصوص رباعی گوئی سے واقفیت حاصل کرتے

ہوئے انیس کی رباعیوں کی فنی خصوصیات اور موضوعات کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔ بعدازاں نصاب میں موجود میر انیسؔ کی دو منتخب رباعیات کی تشریحات اور مطالب سے واقف ہوں گے۔

16.3 میر انیسؔ: تعارف

میر انیسؔ کا شمار اردو کے عظیم شعرا میں ہوتا ہے۔ میر ببر علی نام، انیس تخلص۔ انیس کی ولادت ۱۸۰۲ء میں فیض آباد میں ہوئی۔ ان کے والد میر خلیقؔ اور دادا میر حسنؔ دہلوی تھے جو میر ضاحکؔ کے بیٹے تھے۔ امجد علی شاہ کے زمانے میں انیس کے والد نے فیض آباد سے قطع تعلق کر کے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ اس دور میں میر ضمیرؔ مرثیہ گوئی میں میر خلیقؔ کے ہم پلہ تھے۔ ان ہی کے مشورے پر میر انیس نے مرثیہ گوئی کی طرف خاص توجہ کی۔ انیس کو بچپن ہی سے شاعرانہ ماحول ملا۔ ان کے آبا و اجداد سالہا سال سے اردو کی خدمت میں مصروف رہے۔ کئی پشت سے شاعری کے ساتھ مرثیہ گوئی بھی سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھی۔

میر انیسؔ نے ابتدائی تعلیم و تربیت فیض آباد میں مولوی میر نجف علی سے حاصل کی۔ پھر لکھنؤ آ کر اس دور کے زبردست عالم مولوی حیدر علی سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ شاعری اور زبان دانی انیس نے ورثے میں پائی تھی۔ مرثیہ نگاری ان کا ورثہ تھی، خود فرماتے ہیں:

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

بچپن ہی سے انیس شعر و سخن کی طرف مائل رہے۔ انھوں نے غزل گوئی سے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ جب والد نے نصیحت کی کہ عاقبت کی فکر بھی ضروری ہے تو سلام اور مراثی کی جانب متوجہ ہو گئے۔ والد کی حیات میں ہی انھیں کافی شہرت حاصل ہوئی۔ انھوں نے صنفِ مرثیہ گوئی کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا۔

انیس عربی اور فارسی پر عبور رکھتے تھے۔ فارسی کے شاعر بھی تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف علوم و فنون مثلاً قرآن و حدیث، صرف و نحو، معنی و بیان، عروض، منطق، فلسفہ، تاریخ اسلام، طب اور رمل وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ شہ سواری، فن سپہ گری، شمشیر زنی اور بنوٹ میں مشاق تھے۔ یہی مشق ان کی شاعری میں میدان جنگ کی مرقع کشی میں کارآمد ثابت ہوئی جو ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

میر انیس نے ۱۸۵۹ء میں پہلی بار پٹنہ کا سفر کیا اور ۱۸۶۰ء میں دوسری مرتبہ نواب قاسم علی خاں کے طلب کرنے پر عظیم آباد گئے۔ تقریباً ہر سال اس طرف کا سفر معمول ہو گیا۔ اسی سلسلے میں ۱۸۷۱ء میں حیدر آباد دکن کا بھی سفر کیا۔ حیدر آباد کے سفر کی زحمت سے وہ بیمار ہو گئے لیکن اس کے باوجود مجالس پڑھتے رہے۔ انھوں نے الہ آباد اور بنارس کا بھی سفر کیا۔ ان کی مجالس میں ہزاروں سامعین موجود ہوتے تھے۔ ضعیفی میں بخار، دردِ سر، تپ اور ورم جگر میں مبتلا رہے اور اسی مرض میں دسمبر ۱۸۷۴ء میں انتقال کیا اور اپنے باغ واقع سبزی منڈی، لکھنؤ میں دفن ہوئے۔

خود جانچنے کے سوال

۱۔ میر انیسؔ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

۲۔ میر انیس نے کس صنف سے اپنی شاعری کی ابتدا کی؟

۳۔ میر انیس کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

16.4 میر انیسؔ کی رباعیوں کی خصوصیات

میر انیسؔ اردو کے صفِ اول کے شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ میر انیس کا دور جہاں مرثیہ نگاری کی وجہ سے معروف رہا وہیں ادبیت کے اعتبار سے اعلیٰ قدروں کا عکاس تھا۔ میر ضمیرؔ اور میر خلیقؔ سے زمانہ خالی ہوا تو مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ نے ان کی جگہ لی اور دونوں میں معرکہ آرائی شروع ہوگئی۔

میر انیس نے مراثی کا زبردست سرمایہ چھوڑا ہے۔ شعر و شاعری کے لیے جتنے اوصاف لازمی ہیں وہ سب میر انیس میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ ان کی شاعری مختلف اور متنوع موضوعات کی آئینہ دار ہے۔

انیس نے مرثیہ نگاری کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا۔ ان کے تمام کلام مثلاً مراثی، حمد، نعت، منقبت، نوحہ، سلام میں رثائی عنصر غالب دکھائی دیتا ہے۔ حتیٰ کہ نصائح اور اخلاق کے درس میں بھی المنا کی قائم رہتی ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ حزن و ملال سے پر یاس انگیز اور رقت آمیز اشعار میں بھی صنائع و بدائع کا برابر خیال رکھا۔ صنعتوں کے استعمال میں بے ساختگی و برجستگی کی وجہ سے ان کے اشعار کا شعری حسن نکھر آتا ہے۔ مرثیوں میں رزمیہ شاعری کو جس خوبی کے ساتھ میر انیس نے سمویا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ان تمام لوازم و متعلقات کو بروئے کار لایا ہے جو رزمیہ شاعری کے لیے لازمی ہیں۔

رزمیہ شاعری ہو یا المیہ میر انیس کو واقعہ نگاری، کردار نگاری، جذبات و کیفیات کی تصویر کشی، انسانی نفسیات، پلاٹ کی ترتیب و تکمیل، منظر نگاری، مصوری، مناظر قدرت کی پیش کشی، مرقع نگاری، مذہبی اقدر، سماجی، معاشرتی اور اخلاقی تقاضوں کو روشناس کروانے میں یدطولیٰ حاصل ہے۔ مرثیے کے مکالموں میں انھوں نے خواص کی طرز گفتگو کی خصوصیت بھی قائم رکھی۔ اور یہ قادر الکلامی کی انتہا ہے۔ انیس نے اردو شاعری کو سوز و گداز، زور، شان، شیفتگی، تقدس، اثر اور اخلاقی بلندی عطا کی۔ ان کی وسعتوں اور گہرائیوں کو آفاقیت بخشی۔ فنی نقطہ نظر سے مراثی انیس کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ انیس کے مراثی سے اردو زبان کا دامن بہت وسیع ہوا اور اس میں ہر موقع و محل سے متعلق اظہار خیال کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ اردو شاعری میں ابھی تک کسی نے اتنے الفاظ و محاورات استعمال نہیں کیے جتنے انیس نے کیے ہیں۔ ان کے کلام میں زبان و بیان کے بیش بہا خزانے پوشیدہ ہیں۔ ان کے ہاں فصاحت و بلاغت، صنائع و بدائع، سادگی و سلاست، لفظی و معنی صنعتیں، بندش کی چستی، صفائی، روزمرہ اور محاورہ کا برمحل استعمال، استعارات و تشبیہات، الفاظ و تراکیب کی نشست، اپنے تمام تر زور و اثر اور حسن و خوبی کے ساتھ جلوہ دکھاتی ہیں جو انیس کی فن کاری و قادر الکلامی کی دلیل ہی نہیں بلکہ ان کی استعداد علمی اور وجدانی کیفیت کی آئینہ دار ہیں۔ وہ اپنے دور میں دوسروں کے مقابلے بہتر شعور و حسیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے کلام میں انہی امور کو پیش کرنے کی سعی کی ہے جن کے ذریعے کلام میں تازگی، شگفتگی اور بیداری پیدا ہو۔ وہ ایک حساس، صاحب فہم ذی علم شاعر تھے۔ ان کی طبیعت میں جدت طرازی اور انفرادیت کا عنصر شامل تھا۔ یقیناً ان کا کلام بین الاقوامی ادب کے شانہ بہ شانہ رکھا جا سکتا ہے۔

میر انیس کی شہرت و مقبولیت ان کے عظیم الشان مرثیوں کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے مرثیہ نگاری کے ساتھ ساتھ رباعی

گوئی پر بھی توجہ کی۔ انیس تک پہنچتے پہنچتے اردو رباعی نگاری اپنے شباب پر پہنچ چکی تھی۔ انیس سے قبل جو رباعی گو شعرا ملتے ہیں رباعی نگاری ان کا خاص میدان نہیں تھا۔ انیس کے پیش رووں میں خود ان کے دادا میر غلام حسین حسن دہلوی نے رباعی گوئی کا اہتمام کیا ان کے علاوہ متصوفانہ مضامین کو صنف رباعی نگاری میں برتنے کا وصف خواجہ میر دردؔ کے سر جاتا ہے۔

انیس کے پیش رو شعرا میں کوئی شاعر متنوع موضوعات پر رباعی گوئی میں انیس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہ اس عہد کے کسی شاعر کے یہاں رباعیات کا اتنا وافر سرمایہ ملتا ہے۔ یہی نہیں کہ ان کے یہاں رباعیات کی تعداد کافی ہے بلکہ یہ رباعیات فنی لحاظ سے بھی نہایت اعلیٰ وارفع ہیں۔ لہٰذا کیفیت وکمیت دونوں لحاظ سے میر انیس اردو کے ایک مشہور رباعی گو شاعر مانے جاتے ہیں۔

رباعی نگاری میر انیس کی خاص صنف نہیں تھی پھر بھی انھوں نے متانت وسنجیدگی کے ساتھ ایک اچھوتے طرز بیان میں رباعیاں لکھی ہیں۔ بقول محمد حسن بلگرامی:

> ''انیس کی رباعیوں نے اردو ادب میں ایک بلند مرتبہ پایا ہے ان میں سیدھی سادی باتیں بڑے تیکھے پن سے کہی گئی ہیں۔ جو دل سے نکلتی ہیں اور دل میں اتر جاتی ہیں۔''
>
> (رباعیات انیسؔ مرتبہ سید محمد حسن بلگرامی۔ لکھنؤ ۱۹۷۹ء دیباچہ)

ان کی رباعیوں میں جو تنوع نظر آتا ہے وہ ان سے قبل نہیں ملتا۔ علی جواد زیدی لکھتے ہیں:

> ''جب لکھنؤ میں شمالی ہند کی آخری بساطِ امارت بھی الٹنے لگی اور امید کے آخری دیے بھی بجھنے لگے تو اچھے شاعروں کے یہاں خارجی اور داخلی رنگوں کا وہ امتزاج پیدا ہوا جو رباعی کے لیے سب سے زیادہ سازگار تھا بلکہ جو رباعی کا اصلی آہنگ تھا۔ دلی میں حسرت، سوز، درد، ہدایت، عشق وغیرہ کا ایک پورا سلسلہ ہے جو رباعی گوئی کی طرف بھی ضمناً متوجہ ہوتا ہے۔ یہ سرمایہ ضخیم نہیں لیکن جاذبِ نظر ضرور ہے۔''
>
> (رباعیات انیس ص ۴۸)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ فن رباعی کے عروج کے لیے خالص رباعی گو شاعر کی ضرورت تھی یا پھر کسی ایسے شاعر کی جو کسی خاص صنف سخن کے علاوہ رباعی کو بھی قابل اعتنا سمجھے اور ہمہ وقت اس صنف کے مقام ومرتبہ میں اضافے کے بارے میں سوچتا رہے۔ چناں چہ اس منزل پر ہمیں وہ روایت نظر آتی ہے جو مرثیہ خوانی کے ضمن میں رباعی کے اہتمام سے متعلق ہے اور اس کی ابتدا بھی خود میر حسنؔ سے ہوتی ہے۔ ان سے کئی رثائی رباعیاں موسوم ہیں۔ مشہور ہے کہ مرثیہ گویانِ لکھنؤ میں مرثیہ سے قبل چند رباعیاں بھی تمہیداً پڑھنے کا رواج تھا۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اردو میں رباعیوں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا۔

میر انیس نے غالباً اکثر رباعیاں ایسے ہی موقعوں پر کہی تھیں۔ علی جواد زیدی نے سید محمد عباس کی روایت نقل کی ہے کہ میر انیسؔ:

> ''عموماً مرثیے کی تصنیف سے فرصت پانے کی بعد اور بعض اوقات مجالس میں جاتے وقت سلام اور رباعیاں نظم کرتے تھے، کبھی راہ میں نظم کر لیتے اور مجلس میں جا کر پڑھ دیتے تھے۔ بعض رباعیاں مجلس میں پہنچ کر اور مجمع کو دیکھ کر نظم کی ہیں۔'' (رباعیات انیس ص ۵۴)

میر انیس کی ایسی رباعیاں خاصی تعداد میں ہیں جو اردو ادب کا بہترین ذخیرہ ہیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر سلام سندیلوی رقم طراز ہیں:

''میر انیسؔ کے عہد میں اس بات کا رواج تھا کہ مجلس میں مرثیہ پڑھنے سے قبل ایک دو رباعیاں پھر ایک دو سلام اور آخر میں اصل مرثیہ پڑھتے تھے۔میر انیس نے بھی ان روایات کی تقلید کی۔اس طرح ان کے پاس مرثیوں اور سلاموں کے ساتھ رباعیوں کا بھی ایک زبردست ذخیرہ جمع ہو گیا۔''

(اردو رباعیات ص۳۶۵)

میر انیس کی بیشتر رباعیاں مذہبی ہیں جن میں حمد،نعت،منقبت،معتقدات خصوصاً اہلِ بیت اطہار سے متعلق کہی گئی رباعیاں شامل ہیں۔ان رباعیوں میں صدق دلی ، والہانہ محبت اور گہری عقیدت کا اظہار ملتا ہے۔حمدیہ رباعیوں میں خالص متصوفانہ مضامین جو معرفت ،حقیقت اور وحدانیت وغیرہ موضوعات پر ہیں اور بعض رباعیاں خدا کی صفات ، رزاقی، قہاری، ستاری،غفاری، جود و کرم،عدل و انصاف وغیرہ کے بیان میں ہیں۔چند رباعیات دیکھیے :

حمدیہ:

بندے کو خیال و مبدم تیرا ہے
یہ جسم ترا ہے اور یہ دم تیرا ہے
کرتا ہے جو مجھ سے زرد رو کو سرسبز
اے ابر کرم یہ سب کرم تیرا ہے

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیران ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

نعتیہ:

دنیا میں محمد سا شہنشاہ نہیں
کس راز سے خالق کے یہ آگاہ نہیں
باریک ہے ذکرِ قربِ معراج رسول
خاموش کہ یاں سخن کو بھی راہ نہیں

منقبتی:

میخانۂ کوثر کا شرابی ہوں میں
کیا قبر کا خوف بوترابی ہوں میں

کہتی ہے یہ چشم خشک رکھو نہ مجھے
اے اہلِ نظر مردم آبی ہوں میں

کعبہ کو یداللہ نے آباد کیا
بت توڑ کے مصطفےٰ کا دل شاد کیا
اللہ رے جلال اسمِ اعلائے علی
اصنام کو اس نام نے برباد کیا

مناجاتی:

دولت کی نہ خواہش ہے نہ زر چاہتے ہیں
نے مال نہ اسباب نہ گھر چاہتے ہیں
جو مزرعۂ آخرت ہے وہ خشک نہو
ہاں اک تیری رحمت کی نظر چاہتے ہیں

میر انیس کی رباعیوں میں خاص طور پر رثائی موضوع کو خاصی اہمیت ہے۔ان رباعیوں میں انھوں نے حضرت امام حسینؓ، واقعہ شہادت کربلا اور اس کے متعلقات پر کہی ہیں۔وہ مصائب اہلِ بیت کے پرسوز غم گسار ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انیس کی رثائی رباعیوں میں جو عقیدت مندی، شدتِ جذبات اور زور بیان ہے، وہ دوسروں کی رباعیوں میں نظر نہیں آتا۔واقعاتِ کربلا کا ذکر جن رباعیات میں ہوا ہے وہ سب سے زیادہ دردانگیز اور معنی خیز ہیں۔ملاحظہ ہو:

شہادت حضرت علیؓ

مسجد میں چراغِ دیں خاموش ہوا
ہر سمت فغان و آہ کا جوش ہوا
پہنا ملبوس نیلگوں گردوں نے
کعبہ اسی ماتم پہ سیہ پوش ہوا

شہادت امام حسینؓ

فریاد و فغان و رنج و غم کے دن ہیں
بے شبہہ یہ اندوہ و الم کے دن ہیں
کیوں کر نہ کریں لوگ قیامت برپا
بے سر ہوئے شبّیر ستم کے دن ہیں

پامالیِ شہدا

جب خاتمہ شاہ خوش اقبال کیا

اعدا نے شہیدوں کا عجب حال کیا
گھوڑے دوڑائے چاند سے سینوں پر
سبزے کی طرح گلوں کو پامال کیا

عہد انیس تک اردو رباعیوں کے موضوعات تقریباً متعین ہو چکے تھے اور بیشتر مضامین کا سرچشمہ فارسی کے رباعی نگاروں کا کلام تھا جس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ انیس نے عشقیہ اور خمریاتی رباعیاں نہیں کہیں۔ ان کی رباعیوں میں موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے۔ رثائی رباعیوں کے علاوہ ان کے ہاں اخلاقی، فلسفیانہ، صوفیانہ، ذاتی، سماجی، مذہبی (حمد، نعت، منقبت، معتقدات) مناجاتی وغیرہ موضوعات کا احاطہ ملتا ہے۔ رثائی رباعیاں اگرچہ کہ انیسؔ سے پہلے میرؔ، میر حسنؔ اور مومنؔ وغیرہ کہہ چکے تھے۔ لیکن انیس نے اس موضوع کی طرف خاص توجہ دی۔ اس کے فروغ اور مقبولیت میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ انیس کی رثائی رباعیاں دوسری رباعیوں کی بہ نسبت تعداد میں زیادہ اور زور بیان و شدتِ جذبات سے معمور ہیں۔ انیسؔ کی اثر انگیز رباعیاں زیادہ تر واقعات کربلا اور حضرت امام حسینؓ کے اخلاق وفضائل کے متعلق کہی گئی ہیں۔ چناں چہ واقعات کربلا کے حوالے سے اہل بیت کی مدحت کے ساتھ صبر وشکر، عزم واستقلال، وفاداری، اخوت، جاں بازی، جاں سپاری، ایثار وقربانی، حق پرستی اور جہاد، راست بازی اور صداقت، عجز وانکساری اور ظلم وشقاوت جیسے مختلف موضوعات رباعی میں شامل ہو گئے۔ اس طرح رباعی تصوف اور عشق کے دائرے سے نکل کر زندگی کی اخلاقی قدروں کی ترجمان بن گئی۔ انھوں نے رباعی کو نہ صرف معنوی اعتبار سے وسعت دی بلکہ غزل، قصیدہ اور مرثیہ کی طرح اس صنف کو عوام سے روشناس بھی کرایا۔ رباعی کی اس مجلسی مقبولیت نے اس کی ترقی کے لیے نئی راہیں کھول دیں۔ ان کے ہم عصروں کی ایک پوری صف ان سے متاثر ہوئی اور ان کی تقلید میں رباعیاں کہنے لگی۔ انیس کی اکثر رباعیاں مخصوص مذہبی معتقدات شاعرانہ تعلّی کے اظہار اور مجلسی داد وتحسین حاصل کرنے کے لیے کہی گئی ہیں۔ اس لیے جب تک ان کے مذہبی عقائد، مجلسی لوازم اور رباعی کے شانِ نزول، ان کے مواقع اور پس منظر سے واقفیت نہ ہو ان کی رباعیوں سے لذت اندوز ہونا مشکل ہے۔ لیکن جن رباعیوں میں صداقتِ عامہ اور مصلحانہ جذبات کو شاعرانہ طرز بیان کے ساتھ نظم کیا گیا ہے۔ وہ اپنے زور اثر، برجستگی، سلاست اور روانی کے اعتبار سے آپ اپنا جواب ہیں۔

میر انیس کی رباعیوں میں زیادہ تر دروں بینی اور خود کلامی کی فضا ملتی ہے۔ وہ خارجی حقائق کو کسی نہ کسی طرح سے داخلی بنا لیتے ہیں۔ مختلف موضوعات کی مناسبت سے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنی رباعیوں میں لہجے کی ہمواری اور خیال کی سبک روی سے سب کو متوجہ کر لیتے ہیں اس سلسلے میں علی جواد زیدی لکھتے ہیں:

> ''وہ ایک لمحے کے لیے بھی اخلاقی مقصد واقدار کا دامن چھوڑنے کے روادار نہیں ہیں۔ اس کے لیے وہ دل سے دل تک منتقل کرنے والے لہجے کو ترجیح دیتے ہیں اور دعوت وموعظت کے عامیانہ رویے سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ تہذیب وتوازن کا مسلسل عمل ان کی رباعیوں، سلاموں اور مرثیوں میں یکساں طور سے جاری وساری نظر آتا ہے،۔۔۔ توازن وتہذیب کی یہی مسلسل تلاش بکھری ہوئی کثرت مضامین میں وحدتِ تاثر کا رنگ بھی اختیار کرتی ہے اور ان کے الفاظ کو ایک کھنک اور نئی چمک دمک بھی عطا کرتی ہے۔'' (رباعیات انیس ص ۵۷)

جہاں تک انیس کی سیاسی وسماجی رباعیوں کا تعلق ہے اُن کے یہاں قومی اثرات پائے جاتے ہیں۔انھوں نے مقامی حالات واثرات کے بیان میں ہندوستانی عناصر کو پیش کیا ہے اور جو موضوعات تاریخ وجغرافیہ اور دیگر علوم متداولہ سے متعلق ہیں۔ انہیں ایسا شعری لب ولہجہ عطا کیا ہے کہ ان میں پائی جانے والی علمی کثافت، لطافت میں ڈھل گئی اور ان کی موضوعاتی خشکی ترشح میں بدل گئی ہے۔انیس نے اپنے عہد کے سیاسی وسماجی کوائف کو بھی اپنی رباعیوں میں بیان کیا ہے۔انیس نے پہلی جنگ آزادی کے بعد پیدا شدہ انقلاب زمانہ کی مرقع نگاری یوں کی ہے:

کیوں کر دلِ غمزدہ نہ فریاد کرے
جب ملک کو چرخِ پیر برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ پھر خداوندِ کریم
اجڑی ہوئی مملکت کو آباد کرے

افسوس زمانے کا عجب طور ہوا
کیوں چرخِ کہن آہ نیا دور ہوا
بس یاں سے کہیں اور چلو جلد انیسؔ
اب یاں کی زمین اور فلک اور ہوا

انیس نے فطرت کے مضامین بھی اپنی رباعیوں میں شامل کیے ہیں۔انھوں نے ہندوستانی موسموں کے احوال بطور استعارہ وعلائم کے بیان کیے ہیں۔ان میں مقامی رنگ وبو کی فراوانی ہے۔ان کے یہاں 'ساون بھادوں' کی رت گریہ وزاری کے لیے استعارے کے طور پر برتا ہے۔

آنکھ ابر بہاری سے لڑی رہتی ہے
اشکوں کی ردا منھ پہ پڑی رہتی ہے
دونوں آنکھیں ہیں میری ساون بھادوں
یاں سارے برس ایک جھڑی رہتی ہے

انیس کی رباعیوں میں ہندوستانی اسطوری فکر کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔چناں چہ رباعی میں انھوں نے 'پارس' کے متعلق ہندوستانی خیال کو اہمیت دی ہے۔

جس پر کہ نظر لطف کی شبیر کریں
ادنیٰ اعلیٰ سب اس کی توقیر کریں
جس سنگ کو چاہیں وہ بنادیں پارس
جس خاک کو چاہیں ابھی اکسیر کریں

انیس کی رباعیوں میں ہندوستانی رسوم وروایات کا اظہار کرنے والے محاورے وکہاوتیں بھی استعمال ہوئے ہیں جو

مقامی تہذیب اور رسم ورواج کو واضح کرتے ہیں۔انیس نے اپنی رباعیوں میں مقامی رسم ورواج کی بعض اصطلاحیں بھی استعمال کی ہیں۔ان کی رباعیوں میں ہندوستانی عناصر کے فطرتاً استعمال سے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔

راہی طرفِ عالم بالا ہوں میں
دنیا سے عدم کو جانے والا ہوں میں
یا رب ترا نام پاک جپنے کے لیے
گویا اک ہڈیوں کی مالا ہوں میں

بقول علی جواد زیدی:

''انیس جہاں مرثیے کے بادشاہ ہیں وہاں ان کی رباعیاں بھی اپنا جواب آپ ہیں۔انیس کی رباعیوں کی اہمیت اور خوبی کا اندازہ انھیں پڑھ کر ہی لگایا جاسکتا ہے۔ان میں رباعی کی ساری خصوصیات اور خوبیاں جمع ہوگئی ہیں۔اور وہ اپنے اندر ایسا اثر اور دلکشی رکھتی ہیں جو صرف ان کا حصہ ہے۔''

(رباعیات انیس ص۶۱)

انیس کی رباعیات میں سلاست ورانی، جدت وندرت، فصاحت وبلاغت، تازگی، شگفتگی، نشست الفاظ بلندی تخیل اور آفاقیت اور عمومیت پائی جاتی ہے۔انھوں نے ایک ہی موضوع پر مختلف انداز سے رباعیاں لکھیں اور ہر رباعی میں نیا اور اچھوتا خیال پیش کیا جس کے نتیجے میں ان کی ہر رباعی کو مقبولیت حاصل ہوئی۔بقول محمد حسن

''اس صنف میں ایسے ایسے اکابر طبع آزمائی کر کے نام کما چکے ہیں کہ ان سے آگے قدم بڑھانا سخت دشوار تھا مگر انیس نے یہاں بھی اپنی عظمت کا سکہ منوایا اور رباعی میں اپنا نام ہی نہیں اپنی چھاپ چھوڑ گئے۔ انیس کے نام سے رباعی کا جو مخصوص رنگ وآہنگ پہچانا جاتا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔''

(رباعیات انیس مرتبہ سید محمد حسن بلگرامی دیباچہ)

بہرحال انیس کی رباعی گوئی نے شعروسخن کے خزانے میں ایک گراں بہا اضافہ کیا۔انیس کی رباعی گوئی پر ڈاکٹر سلام سندیلوی کا یہ تاثر نہایت بجا ہے۔

''اگر میر انیس مرثیہ نہ کہتے تو ان کی رباعیات ہی اس قدر بلند مرتبت تھیں جو ان کی حیاتِ ابدی کی ضامن بن جاتیں۔دراصل میر انیسؔ دور متوسط کے سب سے بڑے رباعی گو شاعر ہیں۔ان کی شیریں، پردرد اور بلند آواز صدیوں تک اردو رباعی کی فضا میں گونجتی رہے گی۔''

(اردو رباعیات ص۳۷۹)

خود جانچنے کے سوال

۴۔ میر انیس نے کس صنف سخن کو معراج کمال تک پہنچا دیا؟

۵۔ میر انیس کے پیش روؤں میں کس شاعر نے رباعی گوئی کا اہتمام کیا؟

۶۔ میر انیس کی رباعیوں میں خاص طور پر کس موضوع کو خاصی اہمیت ہے؟

۷۔ میر انیس سے قبل رثائی رباعی گو شعرا کے نام بتایئے؟

۸۔ میر انیس کی رباعیوں میں زیادہ تر۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔کی فضا ملتی ہے؟

16.5 میر انیسؔ کی رباعیوں کا مطالعہ

جس طرح مرثیہ گوئی میں میر انیسؔ ایک منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اسی طرح رباعی گوئی میں بھی ان کا مرتبہ نہایت بلند و بالا ہے۔ان کی ساری رباعیاں نہایت عمدہ اور قابل مطالعہ ہیں۔لیکن ذیل میں ان کی دو منتخب رباعیات اور ان کی تشریحات پیش کی گئی ہیں۔

رباعی ۱: گلشن میں صبا کو جستجو

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

تشریح:

میر انیسؔ اپنی اس رباعی میں خدا کی حمد و ثنا بیان کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ کائنات کے ذرے ذرے میں ہر مادی و غیر مادی شئے میں خدا کی قدرت کارفرما ہے۔اس کارخانۂ ہستی میں اس کی قدرت کے انمول اور انمنٹ نقوش پیوستہ ہیں جس سے دنیا کا کاروبار اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔نباتات و جمادات میں بھی اس کی کارفرمائی کا دخل ہے۔خدا کے حکم سے ان کی نمود ہے۔موسمِ بہار میں چلنے والی ہوا سے گلشن کا کاروبار چلتا ہے۔ہر طرف سبزہ زار لہلہاتے، پھول کھلتے نظر آتے ہیں۔ہریالی ہر طرف اپنا جلوہ دکھاتی ہے دراصل اس کے پسِ پشت قدرت کی کارفرمائی ہے۔موسمِ بہار کی اس تازگی اور دلکشی سے خوش ہو کر پرندے چہچہانے لگتے ہیں۔ان کی چہچہاہٹ اور خوشی میں بھی قدرت کی حمد و ثنا مخفی ہے۔چمن کی تر و تازگی پرندوں کا چہچہانا دراصل خدائے واحد کی حمد و ثنا ہے۔

رباعی کے دوسرے شعر میں انیس کہتے ہیں کہ ہر پھول کے رنگ و روپ میں خدا کی قدرت کا نظارہ ہے جو حسن و جمال ان پھول پتوں میں ہے دراصل وہ اس کی قدرت کی حسن کاری ہے۔جو اس کے جمال ذات کی شہادت ہے کہ اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورت شئے کو پسند کرتا ہے۔کائنات کی ہر چیز میں اس کی نشانی موجود ہے اور ہر چیز اس کی نشانی کے بل بوتے پر پروان چڑھتی ہے اور نکھرتی ہے۔ہر آن اس کی قدرت ایک نئی شان کے ساتھ اس کائنات میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

انیس کی اس رباعی کے چوتھے مصرعے میں ''پھول'' اور ''بو'' کا استعارہ ہے وہ کہتے ہیں کہ ہر چیز کی زبانی یہ اعلان ہوتا ہے کہ یہ حسن و جمال یہ آرائش و زیبائش یہ سرسبزی و شادابی دراصل خدا کی طرف سے ہے اور وہی ان سب کا خالق ہے، لیکن ان سب سے ماورا بھی ہے۔ پھول خوشبو نہیں، لیکن خوشبو کے ذریعہ پھول کی پہچان ہوتی ہے۔ جس طرح پھول میں بو کا وجود ہے اسی طرح اس کائنات میں خدا کا وجود ہے۔

اس مضمون کو مرزا دبیرؔ نے بھی اپنی رباعی میں باندھا ہے مگر میر انیسؔ کی رباعی سلاست و روانی اور رنگ و آہنگ میں بے نظیر ہے۔

خود جانچنے کے سوال

۹۔ اس رباعی کا موضوع کیا ہے؟

۱۰۔ ہر پھول کے رنگ و روپ میں کس کی قدرت کا نظارہ ہے؟

رباعی ۲: رتبہ جسے دنیا میں خدا

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

تشریح:

اس رباعی میں میر انیسؔ کہتے ہیں کہ جو بھی بڑائی جو بھی مقام و مرتبہ انسان پاتا ہے وہ خدا کا ودیعت کردہ ہے۔ اس میں اس کی ذاتی کوئی بڑائی نہیں ہے۔ اس لیے رتبہ حاصل کر کے بندے کو خدا کا مشکور و ممنوں ہونا چاہیے لیکن بجائے اس کے وہ اکثر تکبر و غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے اور سمجھنے لگتا ہے کہ یہ اس کا کارنامہ ہے جس سے اس کو یہ مقام و مرتبہ حاصل ہوا ہے۔ دراصل یہ خیال اس کی کم ظرفی کی دلیل ہے۔ کم ظرف انسان ہی اس قسم کا خیال کرتا ہے۔

ایک ضرب المثل ہے خالی گھڑا آواز بہت دیتا ہے۔ اس ضرب المثل کے لبِ لباب کو معنی عطا کرتے ہوئے انیسؔ نے اس رباعی میں اسے بڑی خوب صورتی سے استعمال کیا ہے جس سے اس رباعی کی معنی آفرینی اور حسن میں اضافہ ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خالی برتن جس طرح بہت زیادہ آواز کرتا ہے، اسی طرح کم ظرف انسان بھی خدا کے ودیعت کردہ فضل و انعام پر اکڑتا اور اتراتا پھرتا ہے۔

میر انیسؔ نے چوتھے مصرع میں جو دعویٰ کیا ہے اس کا شاعرانہ استدلال ابتدائی تین مصرعوں میں کیا ہے۔ یہ مصرع رباعی کی جان ہے۔

میر انیسؔ اس رباعی کے ذریعہ کم ظرف انسان کو عاجزی، خاکساری، انکساری اور مسکینی کا درس دیتے ہیں۔

خود جانچنے کے سوال

۱۱۔ میر انیسؔ اپنی اس رباعی کے ذریعے کم ظرف انسان کو کیا درس دیتے ہیں؟

16.6 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے اردو کے ایک اہم مشہور شاعر میر انیسؔ کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔اس سلسلے میں ان کے سوانحی حالات بیان کیے گئے پھر ان کی شاعری کے آغاز پر روشنی ڈالی گئی۔اس کے بعد میر انیسؔ کی شاعری بالخصوص ان کی رباعی گوئی کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اور ان کی رباعیوں کی فنی خصوصیات و موضوعات کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا۔اس طرح میر انیس اور ان کی رباعی گوئی کی فنی خصوصیات کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کی گئیں۔

میر انیسؔ اردو کے ایک مقبول شاعر ہیں۔اس لیے ان کی دو منتخب رباعیات کی تشریحات اور مطالب سے واقف کیا گیا۔طلبہ کی سہولت کے لیے فرہنگ بھی دی گئی اور امتحانی سوالات کا نمونہ بھی پیش کیا گیا۔آخر میں مزید مطالعے کے لیے اس موضوع سے متعلق چند اہم کتابوں کی نشاندہی بھی کی گئی۔

16.7 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالات کے جوابات تیس تیس سطروں میں دیجیے۔

۱۔ میر انیسؔ کے حالات زندگی کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ میر انیسؔ کی رباعی نگاری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

۳۔ میر انیسؔ کی رباعیوں کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

ذیل کے سوالات کے جوابات پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

۱۔ میر انیسؔ کی رباعی گوئی کے موضوعات پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔

۲۔ اس اکائی میں شامل، اپنی پسند کی کسی ایک رباعی تشریح کے ساتھ کے ساتھ بیان کیجیے۔

16.8 فرہنگ

پشت	: نسل، خاندان	عاقبت	: آخرت
زحمت	: تکلیف، مصیبت	معرکہ آرائی	: لڑائی
یاس	: ناامیدی، مایوسی	رقت	: گریہ، رونا، رحم
بے ساختگی	: سادگی	برجستگی	: بے تکلفی

استعداد	:	لیاقت، قابلیت	وافر	:	بہت کثرت سے
اعتنا	:	غور و پرداخت کرنا	مبدم	:	بدلا ہوا، متغیر
اصنام	:	صنم کی جمع، معشوق، پتھر وغیرہ کے بت	مزرعہ	:	کھیتی
اعدا	:	عدو کی جمع، دشمن	شقاوت	:	سنگدلی، بدنصیبی
خمریاتی	:	ایسی شاعری جس میں شراب اور اس کے لوازمات کا ذکر ہو			
سبک روی	:	تیز رفتاری	ترشح	:	ظاہر، بوندا باندی
ردا	:	چادر	مدحت	:	تعریف، مدح
پارس	:	ایک پتھر جس کی نسبت مشہور ہے کہ دھات کو چھو کر سونا بنا دیتا ہے			
توقیر	:	عزت	گلشن	:	چمن، باغ
صبا	:	صبح کی ہوا	پیوستہ	:	ملا ہوا، ملحق
فروتنی	:	عاجزی، مسکینی، غریبی	تہی مغز	:	احمق، بے وقوف
ودیعت	:	سپردگی	لب لباب	:	خلاصے کا خلاصہ، نہایت خالص
کم ظرف	:	کم حوصلہ، سفلہ	مسکینی	:	عاجزی، انکسار

16.9 معاون کتب

1۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی اردو رباعیات

2۔ علی جواد زیدی رباعیات انیسؔ

3۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ انیس شناسی

اکائی 17 انتخابِ رباعیات (امجد حیدر آبادی)

اکائی کے اہم اجزا

17.1 اغراض ومقاصد

17.2 تمہید

17.3 امجد حیدر آبادی: تعارف

17.4 امجد حیدر آبادی کی رباعیوں کی خصوصیات

17.5 امجد حیدر آبادی کی رباعیوں کا مطالعہ

17.6 خلاصہ

17.7 نمونہ برائے امتحان سوالات

17.8 فرہنگ

17.9 معاون کتب

17.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ امجد حیدر آبادی کے سوانحی حالات بیان کر سکیں۔

☆ امجد حیدر آبادی کے اخلاق وعادات پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ امجد حیدر آبادی کی رباعیات کے موضوعات بیان کر سکیں۔

☆ امجد حیدر آبادی کی رباعیوں کی خصوصیات پر اظہار خیال کر سکیں۔

☆ درسی کتاب میں موجود امجد کی رباعیات کا مفہوم سمجھا سکیں۔

17.2 تمہید

اردو شاعری کی چار اہم اصناف مثنوی، غزل، قصیدہ اور مرثیہ ہیں۔ موجودہ زمانے میں قصیدہ تو ختم ہو گیا ہے۔ مثنوی بھی متروک ہو چکی ہے۔ لیکن غزل ہمیشہ کی طرح تازہ دم اور سدا بہار نظر آتی ہے۔ مرثیے کی روایت بھی گو انیس و دبیر کے عہد کی طرح بام عروج پر نہیں ہے لیکن کربلا کے حوالے سے اب بھی باقی و برقرار ہے۔ ان اصناف سے ہٹ کر اردو شاعری کی جو دیگر اصناف ہیں ان میں رباعی اپنی ایک انفرادیت رکھتی ہے۔ گذشتہ اکائی میں آپ نے رباعی کے فن کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کیں۔ رباعی ایک ایسی صنف ہے جس میں قدیم زمانے سے ہی بہت کم شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک دلچسپ

حقیقت ہے کہ اردو میں بعض ایسے شعرا بھی گزرے ہیں جنھوں نے دیگر اصناف کے مقابلے میں رباعی پر بہت زیادہ توجہ دی اور اس صنف میں اعلیٰ وارفع مقام حاصل کیا۔ ایسے ہی شعرا میں سے ایک حضرت امجد حیدرآبادی ہیں، جنہیں شہنشاہِ رباعیات کہا جاتا ہے۔ اس اکائی میں ہم امجؔد حیدرآبادی کے سوانحی حالات اور ان کی رباعیوں کا مطالعہ کریں گے۔

17.3 امجد حیدرآبادی: تعارف

اردو رباعیات کی تاریخ میں امجد حیدرآبادی کا نام ایک امتیازی مقام کا حامل ہے۔ جس طرح غزل کو میرؔ و غالبؔ نے قصیدے کو سوداؔ اور ذوقؔ نے اور مرثیے کو انیسؔ و دبیرؔ نے بام کمال پر پہنچایا اسی طرح اردو رباعی کو بام عروج پر پہنچانے میں امجد حیدرآبادی نے اہم حصہ لیا۔

امجؔد کا پورا نام سید احمد حسین کنیت ابوالاعظم اور تخلص امجد تھا۔ وہ ۱۸۸۶ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید رحیم علی ابن سید کریم حسین اور والدہ کا نام صوفیہ بیگم تھا۔ ان کے والد اپنے وقت کے صوفی اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ امجد کی عمر ابھی چالیس (۴۰) دن ہی کی تھی کہ ان کے والد کا اچانک انتقال ہوگیا۔ امجؔد کی والدہ صوفیہ بیگم نہایت نیک اور صوم وصلوٰۃ کی پابند خاتون تھیں۔ وہ نہایت کم عمری میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ لیکن انہوں نے امجؔد کی تعلیم وتربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ امجد کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد انہیں جامعہ نظامیہ حیدرآباد میں داخل کیا گیا۔ یہاں انہوں نے چھے سال تک تعلیم حاصل کی۔ وہ ابتدا ہی سے ذہین تھے اور حافظہ بھی تیز تھا اس لیے جو کچھ پڑھتے وہ پتھر کی لکیر ہوجاتا۔ جامعہ نظامیہ کے اساتذہ مولانا سعید الدین سہانپوری، مولانا ابوایوب بہاری، علامہ سناد الملک شوستری، اور علامہ سید نادر الدین نے امجؔد کی فطری صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے میں اہم حصہ لیا۔ امجد نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان امتیازی حیثیت سے کامیاب کیا۔

امجد کی عمر جب ۱۸ سال کی ہوئی تو ان کی والدہ نے ان کی شادی شیخ میراں صاحب کی صاحبزادی محبوب النساء بیگم سے کی جن سے انہیں ایک لڑکی اعظم النساء پیدا ہوئی۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد امجد نے ملازمت کے سلسلے میں بنگلور کا سفر کیا اور وہاں ایک فوجی چھاؤنی میں قائم عیسائی مشن اسکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد انہوں نے یہ ملازمت ترک کردی اور ایک پارسی ڈاکٹر کی سفارش پر ناظم تعلیم بنگلور نے امجد کا تقرر بحیثیت مدرس سٹی ہائی اسکول پر کیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد والدہ کے بلانے پر انہوں نے یہ ملازمت بھی چھوڑ دی اور حیدرآباد آگئے۔ حیدرآباد آنے کے بعد وہ مدرسہ دارالعلوم میں مدرس مقرر ہوئے اور کئی سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ امجد اپنے طلبہ کو بڑی شفقت اور محبت سے پڑھاتے تھے اس لیے بچے ان کے گرویدہ تھے۔

مدرسہ دارالعلوم میں ایک لمبی مدت تک مدرس کے فرائض انجام دینے کے بعد امجد کی خدمات صدر محاسبی حیدرآباد کو منتقل کی گئی۔ جہاں وہ ترقی کرتے ہوئے مددگار صدر محاسب کے عہدے پر پہنچے اور اسی عہدے سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

امجؔد کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ موسیٰ ندی کی طغیانی ہے۔ ۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی میں زبردست طغیانی آئی اور حیدرآباد کے اکثر محلے سیلاب میں بہہ گئے۔ امجد کا مکان موسیٰ ندی کے بالکل قریب واقع تھا۔ اس لیے وہ بھی سیلاب کی زد میں آگیا۔ نہ صرف گھر کا سارا مال واسباب طغیانی میں بہہ گیا بلکہ امجؔد کی والدہ، بیوی اور چہیتی چار سالہ بچی اعظم النساء بھی دیکھتے ہی دیکھتے امجد کی آنکھوں کے سامنے ندی میں ڈوب گئے۔ خود امجد بھی بڑی دور تک موجوں کے ساتھ بہتے رہے۔ پھر اتفاقاً ان کی جان

بچ گئی۔اس دردناک حادثے نے امجدؔ کے دل ودماغ پر شدت سے اثر ڈالا۔

امجدؔ کی اُجڑی ہوئی زندگی کو دیکھ کران کے استاد مولانا نادرالدین نے اپنی لڑکی جمال النساء کی شادی امجد سے کردی۔ شادی کے ۱۴ سال بعد جب جمال النساء کا بھی انتقال ہوگیا تو امجد نے سید ابراہیم حسینی صاحب کی دختر قمر النساء بیگم سے عقد کیا لیکن ان بیویوں سے امجد کو کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

۱۹۵۵ء میں حیدرآباد کے مشہور ادبی ادارے ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے امجد کی چالیس سالہ شعری خدمات کے اعتراف میں ان کی ڈائمنڈ جوبلی نہایت دھوم دھام اور اہتمام سے منائی گئی۔امجدؔ نے مشاعروں کے سلسلے میں ہندوستان کے بعض اہم شہروں کا سفر کیا۔وہ اپنی اہلیہ جمال النساء کے ساتھ حج وزیارت کے سفر پر بھی گئے تھے۔۲۹/مارچ ۱۹۶۱ء کو امجدؔ کا انتقال ہوگیا۔

امجد ایک صوفی منش اور قلندر صفت انسان تھے۔ان کے مزاج میں سادگی اور خودداری تھی۔وہ سادہ غذا اور سادہ لباس استعمال کرتے تھے۔بڑے عہدے پر فائز تھے لیکن طبیعت میں غرور نام کو نہ تھا۔وہ بڑے مہمان نواز اور کشادہ دست تھے۔کسی فقیر کو خالی ہاتھ نہ لوٹاتے تھے۔ملاقاتیوں میں دولت مند ہو یا غریب اعلیٰ شخصیت ہو یا معمولی آدمی سب سے ایک جیسا سلوک کرتے تھے۔

امجدؔ نے رباعی گوئی میں شہرت اور نام وری حاصل کی۔لیکن انہوں نے نظم ونثر دونوں میں گراں قدر تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔نثری تصانیف میں حج امجد، جمال امجد، حکایات امجد، گلستانِ امجد، میاں بیوی کی کہانی، ایوب کی کہانی، اور پیام امجد اہم ہیں۔شعری تصانیف میں ریاض امجد حصہ اول ودوم، رباعیات امجد (تین حصے)، خرقۂ امجد اور نذرِ امجد اہم ہیں۔

خود جانچنے کے سوال

1۔ امجدؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
2۔ امجدؔ کا مکاں کہاں واقع تھا؟
3۔ امجدؔ کیسے انسان تھے؟

17.4 امجدؔ حیدرآبادی کی رباعیوں کی خصوصیات

شاعری میں امجدؔ نے غزلیں بھی لکھیں اور نظمیں بھی۔لیکن جس صنف کی بدولت امجد کو اور امجد کی بدولت جس صنف کو عظمت اور بلندی حاصل ہوئی وہ رباعی ہے۔امجدؔ کی رباعیات اردو شاعری کا بے مثل سرمایہ ہیں۔ان کی رباعیات انسانی زندگی کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویریں ہیں جو حیات وکائنات کے کسی نہ کسی پہلو کی نقاب کشائی کرتی ہیں۔ایک عظیم شاعر کی طرح امجد نے زندگی کو جس نظر سے دیکھا، جس طرح محسوس کیا، جس طرح برتا، ٹھیک اسی طرح اس کو اپنی شاعری بالخصوص اپنی رباعیات میں سمویا۔انہوں نے ناصحانہ، واعظانہ، حکیمانہ، فلسفیانہ، اخلاقی اور صوفیانہ ہر قسم کی رباعیاں لکھیں۔لیکن چوں کہ وہ خود ایک صوفی تھے اور تصوف سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اس لیے ان کی رباعیات میں تصوف کا عنصر غالب ہے۔ان کی رباعیات میں فکر کی بلندی اور معنی کی گہرائی کے ساتھ زبان کا حسن، طرز ادا کی نزاکتیں اور فن کی باریکیاں سبھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

امجدؔ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیں مجاز سے حقیقت کی طرف دنیاوی لالچ اور حرص وہوس سے آخرت طلبی اور

خدا کی محبت کی طرف لے جاتے ہیں۔ایسے دور میں جب کہ ہر طرف مادہ پرستی کا غلبہ ہے،امجد کی رباعیات ہمیں روحانی اور اخلاقی پاکیزگی کی تعلیم دیتی ہیں۔انسانیت کا ایک اعلیٰ وارفع پیغام دیتے ہیں جو تمام انسانوں کے لیے ہے اور جس کی بنیاد قرآن وحدیث پر ہے۔امجد کے کلام میں بڑی تاثیر،کشش اور قوت پائی جاتی ہے۔فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات کی وجہ سے عام طور پر شاعرانہ حسن ختم ہوجاتا ہے۔لیکن امجد کا کمال یہ ہے کہ وہ شاعری کے جمالیاتی کیف کو ہر وقت پیش نظر رکھتے ہیں۔وہ دقیق سے دقیق مضامین کو نہایت سادہ سلیس اور عام فہم زبان میں اور اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اپنے اندر ایک خاص طرح کی کیفیت محسوس کرتا ہے۔امجد کی رباعیات میں سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔انہوں نے رباعیوں میں محاوروں،لطیف تمثیلوں اور تازہ تشبیہات کا بے ساختہ استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی رباعیوں کے حسن ودلکشی اور زور واثر میں بے پناہ اضافہ ہوگیا ہے۔ذیل میں چند رباعیات بطور نمونہ پیش ہیں۔

ہر چیز مسبّبِ سبب سے مانگو
منّت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے
بےفکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آساں کردی
دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

دامانِ گناہ چاک ہوجاتا ہے
نفس سرکش ہلاک ہوجاتا ہے
مومن کے لیے عجیب نعمت ہے نماز
سرخاک پہ رکھ کے پاک ہوجاتا ہے

امجد کا کلام ان کی قلبی واردات اور انکشافات کا آئینہ ہوتا ہے۔اردو کے مشہور شعرا اور ناقدین نے امجد کی فنی عظمت اور فکر کی گہرائی کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں شہنشاہ رباعی،حکیم الشعرا،سعدیٔ دکن اور سرمد ثانی کے خطابات سے یاد کیا ہے۔ذیل میں چند اکابر ادب کے خیالات پیش کیے جاتے ہیں۔

علامہ اقبال:''ہر رباعی قابل داد ہے۔ان کے پڑھنے سے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے''

علامہ علی حیدر نظم طباطبائی:''رباعیاتِ امجد کی داد دینا سخن شناسی کا مقتضا ہے''

مولانا مناظر احسن گیلانی:''حضرت امجد ہندوستان کے ان شعرا میں ہیں جن کو زمانہ صدیوں کے بعد

پیدا کرتا ہے''

مولانا عبدالماجد دریابادی: ''رباعیات امجد معنویت کی بلندی اور طرز ادا، دونوں حیثیت سے قابل داد ہیں''

مولوی عظمت اللہ خاں عظمت: ''رباعیات امجد زندگی کے اعلیٰ ترین رُخ کی تفسیر ہیں اور بہ لحاظ ادب اظہار خیال کا بہترین نمونہ ہے''

پروفیسر وحیدالدین سلیم: ''امجد صاحب قدرتی شاعر ہیں۔ مبصرین کی رائے میں اس وقت ہندوستان میں ان کی ٹکر کا رباعی کہنے والا کوئی شاعر نہیں''۔

مولانا سید سلیمان ندوی: ''حضرت امجد کی ہستی نہ صرف سرزمین دکن کے لیے بلکہ سارے ہندوستان کے لیے باعث فخر ہے۔ آپ نے اپنی شاعری میں انفرادیت کی شان پیدا کر لی ہے''۔

امجد کی بیشتر رباعیات قرآن مجید و احادیث نبی ﷺ سے ماخوذ ہیں۔ بعض رباعیات میں انھوں نے قرآنی آیت کی شرح اس خوبی اور ندرت کے ساتھ بیان کی ہے کہ اصل آیت کا مفہوم پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے اپنی امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے آگے پیش کی۔ اس کو اٹھانے سے انھوں نے انکار کیا مگر انسان نے اٹھالیا۔ تحقیق کہ وہ جاہل تھا اور اپنے آپ پر اس نے ظلم کیا۔ اس خیال کو امجد نے اپنی ایک رباعی اس طرح آگے بڑھایا ہے کہ چوتھے مصرعے کا لطف اور کیفیت بیان سے باہر ہے۔

اِس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے
کیا ذکرِ صفات، ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی
سب کچھ سہی، تیری بات رکھ لی میں نے

امجد کی رباعیات میں فکر و تخیل کی خوبیوں اور اظہار و بیان کے محاسن کا امتزاج نظر آتا ہے۔ امجد کو جہاں اعلیٰ تخیلات کی دولت قدرت سے عطا ہوتی وہیں ان تخیلات کے اظہار کے لیے انھیں بیان کا بھی وہ انداز ملا کہ جو شعر ان کی زبان سے نکلا وہ موزوں سانچے میں ڈھلا ہوا اور کیف و اثر میں ڈوبا ہوا نکلا، مثلاً ذیل کی رباعیات دیکھیے۔

بیکس ہوں نہ مال ہے نہ سرمایا ہے
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لایا ہے
یارب تری رحمت کے بھروسے امجدؔ
بند آنکھ کیے یوں ہی چلا آیا ہے

ناحق پھر پھر کے سر پھرایا میں نے
اپنی کوشش سے کچھ نہ پایا میں نے

طوفان میں ہے کشتیِ امید مری
لے تو ہی سنبھال ہاتھ اٹھایا میں نے

امجدؔ کی رباعیات میں پند ونصیحت کا انداز بھی نمایاں ہے۔انہوں نے رباعیات کو تلقین وہدایت اور اخلاقی اصولوں کی ترسیل کا ذریعہ بنایا۔صبر وتوکل،قناعت واستغنا،تسلیم ورضا،عبرت وفنا اور توحید وعبدیت جیسے موضوعات پر ان کی بصیرت افروز اور حکیمانہ رباعیات پڑھنے والوں کے دل ودماغ کو بیک وقت متاثر کرتی ہیں۔

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے
مانندِ حباب اُبھر کر اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر خسیس
تنکا تھوڑی ہوا سے اُڑ جاتا ہے

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں
پھر بھی اثر دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ، پڑھتے ہیں نماز
کرتے نہیں پرہیز، دو اکھاتے ہیں

امجدؔ کی رباعیات پر اثر ہونے کے علاوہ نہایت سادہ وسلیس، عام فہم اور وجد آفریں ہوتی ہیں۔ان میں سادگی، روانی اور بے ساختگی کا یہ عالم ہے کہ نظم نثر معلوم ہوتی ہے۔اپنی شاعری کے اس وصف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امجد اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میری رباعیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ زبان ایسی ہوتی ہے جس کو ہر خرد وکلاں بغیر کسی دقت کے سمجھ سکتا ہے اور میرا نصب العین یہ ہے کہ ناظرین کو سکون قلب حاصل ہو اور توفیق الٰہی تائید کرے تو قوت عمل پیدا ہو'' (مکتوب بنام سلام سندیلوی بحوالہ ماہنامہ ''سب رس'' حیدرآباد، امجد نمبر، مئی جون ۱۹۶۲ء ص ۵۶)

امجد کی رباعیات میں کہیں فلسفہ کی جھلک ہے تو کہیں معرفت کی گہرائی، کہیں درد وغم کا بیان ہے تو کہیں اخلاق و انسانیت کا پیغام۔ان کی ہر رباعی میں کوئی نہ کوئی نکتہ یا دانائی کی بات یا تصوف وروحانیت کے کسی رمز کی تشریح پائی جاتی ہے۔ان کے اکثر مصرعوں میں ضرب المثل بننے کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔

کچھ وقت سے اک بیج شجر ہوتا ہے
کچھ روز میں اک قطرہ گہر ہوتا ہے
اے بندہ ناصبور تیرا ہر کام
کچھ دیر میں ہوتا ہے مگر ہوتا ہے

نادانی سے پہلے تو خطا کرتے ہیں
ہٹ کر کے پھر اور بھی بُرا کرتے ہیں
جب تم سے کوئی گنہ ہو توبہ کرلو
میلے کپڑے کو دھولیا کرتے ہیں

ہم صحبت بے خرد ،پریشان رہا
نا فہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی
نادان کو اُلٹا بھی تو نادان رہا

امجد بذات خود ایک مذہبی بزرگ، خدارسیدہ اور پاکباز انسان تھے۔ان کی شخصیت کا اثر ان کی رباعیات پر بھی نظر آتا ہے۔وہ تصوف کے مسائل کو رباعی کے چار مصرعوں میں اس طرح آسان بنا کر پیش کرتے ہیں کہ ہر آدمی کی سمجھ میں آجاتا ہے۔

امجد کی رباعیات صنف رباعی کے فنی اصولوں کا کامل نمونہ پیش کرتی ہیں۔ان میں خیالات کی ندرت، بیان کا زور، طرز ادا کی سحر انگیزی اور مضمون کی دلکشی پائی جاتی ہے۔ان کی رباعیات کے چاروں مصرعوں میں کچھ ایسا معنوی ربط و تسلسل ہوتا ہے کہ چاروں مصرعے ایک دوسرے سے پیوست معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں مضمون یا خیال بتدریج ارتقا پاتا ہے جو تیسرے مصرعے میں کلائمکس کو پہنچا ہے اور چوتھا مصرعہ گویا گڑی کمان کا تیر ہوتا ہے جو سیدھے دل پر لگتا ہے اور پڑھنے والا دیر تک اس کا لطف واثر محسوس کرتا ہے۔

بے خود میں رہوں تو وہ قریں آتا ہے
پردے میں ہی وہ پردہ نشیں آتا ہے
وہ جب آتا ہے میں نہیں رہتا ہوں
میں جب رہتا ہوں وہ نہیں آتا ہے

بے فائدہ کب ہے جبہ سائی اچھی
طاعت میں نہیں ہے خود نمائی اچھی
اک سجدہ میں خاک کردیا ہستی کو
حضرت ! تم سے دیا سلائی اچھی

کب تک ہے بقائے تن فنا کو معلوم

کب تک ہے یہ زندگی قضا کو معلوم
ہر سانس یہ کہہ رہی ہے جاتے جاتے
جاتی تو ہوں واپسی خدا کو معلوم

تصوف اور فلسفے کا اس قدر حسین امتزاج رباعیات امجد کے علاوہ کسی دوسرے اردو رباعی گو شاعر کے یہاں مشکل سے ملتا ہے۔ ان کے کلام سے ان کے روحانی جوش کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ بلاشبہ اردو کے سرمد اور سعدی تھے۔ جنھوں نے اپنی رباعیات میں مشرق کی اخلاقی وروحانی قدروں کی ترجمانی کی۔

خود جانچنے کے سوال

4۔ کس صنف کی بدولت امجد کو عظمت حاصل ہوئی؟
5۔ امجد کی رباعیاں کس بات کی تعلیم دیتی ہیں؟
6۔ امجد کی اکثر رباعیاں کس سے ماخوذ ہیں؟

17.5 امجدؔ حیدر آبادی کی رباعیوں کا مطالعہ

امجدؔ حیدر آبادی نے متعدد رباعیات لکھی ہیں۔ ان کی رباعیات کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں یوں تو ان کی ہر رباعی فن اور معنی کے اعتبار سے لاجواب ہوتی ہے۔ لیکن ذیل میں ان کی صرف دو رباعیات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

رباعی 1: خالق نے جنہیں دیا ہے

خالق نے جنھیں دیا ہے زر، دیتے ہیں
زر کیا ہے، خدا کی راہ میں گھر دیتے ہیں
اپنا سرمایہ ہے رکوع و سجدہ
سامان نہیں رکھتے ہیں سر دیتے ہیں

اس رباعی کا مضمون یا مرکزی خیال یہ ہے کہ انسان چاہے امیر ہو یا غریب نیکی کرنے اور ثواب کمانے کا موقع ہر ایک کو حاصل ہے۔

اس رباعی کے پہلے دو مصرعے دولت مند لوگوں سے متعلق ہیں۔ ان میں ایسے امیروں اور دولت مندوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو روپیے پیسے اور دھن دولت کے مالک ہیں اور ساتھ ہی ساتھ نیک اور خدا ترس بھی واقع ہوئے ہیں۔ یہ لوگ خدا کے عطا کیے ہوئے مال کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور ثواب بھی حاصل کرتے ہیں اور خدا کی خوشنودی بھی۔ چناں چہ دنیا میں ایسے بہت سے دولت مند لوگ ہیں جو غریبوں کی مدد کرتے ہیں، ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرتے ہیں، بھوکوں کو کھلاتے ہیں، ننگوں کو کپڑے پہناتے ہیں اور ہر طرح کے نیکی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں زر تو کیا

اپنا گھر بھی لٹا دیتے ہیں۔ چناں چہ اسلام کی تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں جن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نیک دل لوگوں نے اللہ کو خوش کرنے کے لیے اپنے گھر کا تمام مال واسباب اللہ کی راہ میں لٹا دیا۔ مالدار لوگ اللہ کی راہ میں اپنی دولت خرچ کر کے نیکی کما سکتے ہیں۔لیکن سوال یہ ہے کہ بے چارہ غریب آدمی کیا کرے؟ نہ اس کے پاس دھن دولت ہے نہ مال واسباب،اس کے لیے اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھرنا ہی مشکل ہے تو وہ راہ خدا میں خرچ کرنے کے لیے روپیہ پیسہ کہاں سے لائے گا۔اور جب نیکی کے کاموں میں پیسہ نہیں خرچ کرے گا تو نیکی اور ثواب کیسے حاصل کرے گا۔ایسے غریب لوگوں کو امجد تسلی دیتے ہیں کہ انہیں گھبرانے اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔اگر امیر آدمی روپیہ خرچ کر کے ثواب حاصل کرتا ہے تو غریب آدمی اللہ کی عبادت کے ذریعہ ثواب حاصل کرسکتا ہے۔اس کے پاس زر نہیں تو کیا ہوا سر تو ہے جسے خدا کی بارگاہ میں جھکا کر وہ خدا کی خوشنودی حاصل کرسکتا ہے۔

اصل میں عبادت دو طرح کی ہوتی ہیں ایک مالی اور دوسری بدنی۔ مالدار لوگ صدقہ وخیرات کے ذریعہ مالی عبادت انجام دیتے ہیں۔غریب آدمی بدنی عبادتوں جیسے روزہ،نماز،قرآن مجید کی تلاوت اور ذکر وغیرہ کے ذریعہ خدا کو راضی وخوش کرسکتا ہے۔

اس طرح امجد حیدرآبادی نے اس رباعی کے ذریعہ غریب اور نادر لوگوں کو جسمانی عبادت کے ذریعہ ثواب حاصل کرنے کا راستہ دکھایا ہے جس میں روپیہ پیسہ خرچ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

اس رباعی کے چوتھے مصرعے میں امجد نے محاورہ سر دینا استعمال کیا ہے جس کے معنی ہیں جان دینا یا جان قربان کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر غریب کے پاس دولت نہیں تو کیا ہوا اس کے پاس جان تو ہے جسے وہ اللہ کی راہ میں قربان کرسکتا ہے۔

خود جانچنے کے سوال

7۔ اس رباعی کے پہلے دو مصرعوں میں کس کا ذکر ہے؟

8۔ اس رباعی کے ذریعے امجد نے کس کو ثواب حاصل کرنے کا راستہ دکھایا ہے؟

رباعی 2: خود اپنی نگاہوں سے

خود اپنی نگاہوں سے گرا جاتا ہوں
قطرہ سا، زمین میں سما جاتا ہوں
احباب مرے دفن کی کیوں فکر میں ہیں
میں شرم گنہ سے خود گڑا جاتا ہوں

اس رباعی کا مضمون یا مرکزی موضوع یہ ہے کہ جس انسان کا ضمیر یا احساس زندہ ہوتا ہے وہ اپنی غلطیوں،کوتاہیوں، گناہوں یا بداعمالیوں پر بڑی ندامت اور شرمندگی محسوس کرتا ہے۔اس رباعی میں ایک ایسے انسان کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی گئی ہے جس کا ضمیر ابھی زندہ ہے۔ یہ انسان شیطان اور نفس کے بہکاوے میں آ کر گناہ کے کاموں میں اللہ کی نافرمانی میں گزارتا ہے۔لیکن جب اس کے مرنے کا وقت آتا ہے تو اسے اپنے گناہوں پر بڑی ندامت محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ پر افسوس کرنے لگتا ہے کہ اس نے ایسے گرے ہوئے کام کیوں کیے۔خدا نے تو اسے اشرف المخلوقات یعنی ساری مخلوقات میں سب

سے افضل بنایا تھا لیکن اس نے شیطان کے ورغلانے پر ایسے کام کیے جو نہیں کرنے چاہیے تھے۔ ان کی وجہ سے وہ گناہوں کے گڑھے میں گرتا گیا اور اس کا مرتبہ پست سے پست ہوتا چلا گیا۔ اپنے کالے کرتوت دیکھ کر وہ انسان خود اپنی نظر سے گر جاتا ہے۔ وہ شرمندگی اور پچھتاوے میں اس طرح ڈوب جاتا ہے جیسے پانی کا قطرہ زمین میں سما جاتا ہے۔ اس کیفیت میں وہ سوچتا ہے کہ اسے موت کے قریب دیکھ کر اس کے دوست احباب اسے دفن کرنے کے انتظامات میں لگے ہوئے ہیں جب کہ زمین میں گاڑے جانے سے قبل وہ خود شرم کے مارے گڑا جا رہا ہے کہ اپنے گناہوں کے ساتھ وہ خدا کو کیا منہ دکھائے گا۔

اس رباعی میں جہاں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ جو انسان غفلت کی زندگی گذارتا ہے وہ اپنے نفس کی خواہشات کی تکمیل میں گناہ پر گناہ کرتا جاتا ہے۔ لیکن جب آخری وقت آن پہنچتا ہے تو اُسے سوائے افسوس اور پچھتاوے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس طرح یہ رباعی درس دیتی ہے کہ ہمیں ان تمام گناہوں اور بُرے کاموں سے بچتے رہنا چاہیے جن کے نتیجے میں اللہ کے آگے خفت و شرمندگی اٹھانی پڑے۔ ہمیں اپنی زندگی اس طرح گذرانا چاہیے کہ جب ہمارا آخری وقت آن پہنچے تو ہمارا ضمیر ندامت کی بجائے پوری طمانیت اور خاطر جمعی محسوس کرے اور ہم سکون اور اطمینان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوں۔

اس رباعی میں امجد حیدر آبادی نے دو محاورے استعمال کیے ہیں۔ پہلے مصرعے میں محاورہ 'نگاہوں سے گرنا' استعمال کیا ہے اور دوسرے مصرعے میں 'زمین میں سمانا' محاورہ ہے جس کے معنی ہیں زمین میں گڑنا یا شرم، یا غیرت کے مارے زمین میں گڑ جانے کی آرزو کرنا۔ چوتھے مصرعے میں شرم سے گڑنا کا محاورہ باندھا ہے جس کے معنی ہیں شرمندگی یا خجالت کے مارے زمین میں دفن ہو جانے اور منہ چھپانے کی آرزو کرنا از حد نادم ہونا۔ یہ تمام محاورے رباعی کی معنوی فضا میں عجیب تاثیر اور لطف پیدا کر رہے ہیں۔

خود جانچنے کے سوال

9۔ آدمی خود اپنی نگاہوں سے کب گر جاتا ہے؟

10۔ اس رباعی میں کتنے محاورے استعمال کیے گئے ہیں۔

17.6 خلاصہ

امجد حیدر آبادی جن کا پورا نام سید احمد حسین تھا ۱۸۸۶ء میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ ابھی دودھ پیتے بچے ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کی والدہ نے ان کی تعلیم و تربیت کی۔ ان کی زندگی آفات و صدمات کا شکار رہی، حیدر آباد میں ان کا مکان موسیٰ ندی کے کنارے واقع تھا۔ ۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی میں زبردست طغیانی آئی اور اس کے دونوں کنارے کے مکانات سیلاب میں بہہ گئے۔ امجد کا خاندان بھی سیلاب کی زد میں آ گیا اور ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی والدہ، بیوی اور بیٹی پانی میں ڈوب گئے۔ خود وہ بھی طغیانی میں ڈوبتے ڈوبتے بچ گئے۔ اس حادثے کا ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر ہوا جس کا اظہار ان کی شاعری میں بھی ہوا ہے۔

امجد حیدر آبادی بہت اچھے نثر نگار اور خوش بیان شاعر تھے۔ نثر میں کئی کتابیں ان سے یادگار ہیں جیسے حج امجد، حکایات

امجد،گلستان امجد،میاں بیوی کی کہانی وغیرہ

امجد کو شاعری میں بھی کامل مہارت حاصل تھی۔انہوں نے حمد،نعت،منقبت،غزل،نظم مثنوی اور رباعی جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔انہیں صنف رباعی سے طبعی مناسبت تھی۔انہوں نے سینکڑوں رباعیات لکھیں اوران کی ہر رباعی لاجواب اور بے مثال ہے۔اس لیے انہیں شہنشاہ رباعیات کہا جاتا ہے۔امجد ایک پاک سرشت صوفی منش اور قلندر صفت انسان تھے۔ انہوں نے اپنی رباعیات میں قرآن وحدیث کی ترجمانی کی ہے۔اخلاقی وصوفیانہ مضامین بیان کیے ہیں اور حکیمانہ وفلسفیانہ خیالات کی ترسیل کی ہے۔اسی لیے انہیں حکیم الشعرا،سرمد سعدی اور سعدی دکن کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

امجد کا انتقال ۱۹۶۱ء میں ہوا۔انہوں نے رباعیات کے تین مجموعے چھوڑے جوان کی زندگی ہی میں شائع ہوئے۔

اس اکائی میں ہم نے امجد حیدرآبادی کے حالاتِ زندگی سے واقفیت حاصل کی۔ان کی رباعیوں کی خصوصیات کا جائزہ لیا اوران کی دو رباعیوں کا مطالعہ بھی کیا۔

17.7 نمونہ برائے امتحان سوالات

مندرجہ ذیل سوالات کے تیس تیس سطروں میں جواب لکھیے۔

۱۔ امجد حیدرآبادی کے سوانحی حالات تحریر کیجیے۔

۲۔ امجد حیدرآبادی کی رباعی گوئی کے امتیازات واضح کیجیے۔

مندرجہ ذیل سوالات کے پندرہ پندرہ سطروں میں جواب لکھیے۔

۱۔ امجد کو شہنشاہ رباعیات کیوں کہا جاتا ہے؟

۲۔ امجد کی تصانیف پر روشنی ڈالیے۔

17.8 فرہنگ

بام عروج	:	ترقی کی انتہا	طغیانی	:	سرکشی،سیلاب
کنیت	:	وہ نام جو باپ،ماں،بیٹا،بیٹی وغیرہ کے تعلق سے بولا جاتا ہے			
صدر محاسب	:	سرکاری حسابات کا سب سے بڑا افسر	صوفی منش	:	متقی اور پارسا شخص
قلندر صفت	:	اصطلاح فقرا میں دین ودنیا سے آزاد آدمی،دنیا کی فکر سے بے پروا آدمی			
کشادہ دست	:	خوش حال،بڑے دل والا	گراں قدر	:	قیمتی
خرقہ	:	پیوند لگا ہوا کپڑا،گدڑی،درویشوں کا لباس	مجاز	:	حقیقت کی ضد،غیر حقیقی
ارفع	:	نہایت بلند،عالی مرتبہ	جمالیاتی	:	حسن سے متعلق
مسبب	:	وجہ،باعث	سخن شناسی	:	بات کی سمجھ،شاعری کی سمجھ

سعدی	:	فارسی زبان کے ایک بڑے شاعر	مقتضا	:	تقاضا کیا گیا، مطلب، مراد
سرمد	:	غیر فانی، مست، مجذوب، ایک مجذوب کا نام	امتزاج	:	ملاوٹ، آمیزش، ہم آہنگی
توکل	:	بھروسہ کرنا، اپنے کام کو کسی کے حوالے کرنا	خرد و کلاں	:	چھوٹے بڑے
قناعت	:	تھوڑی چیز پر خوش رہنا، جو مل جائے اس پر راضی رہنا			
استغنا	:	بے پروائی، بے نیازی، بے فکری	معرفت	:	پہچان، خدا شناسی
رمز	:	راز، بھید، باریک بات	ناصور	:	بے صبر
ہم صحبت	:	ساتھ رہنے والا	بے خرد	:	بے عقل
پشیمان	:	شرمندہ	ندرت	:	نیا پن
جبہ سائی	:	پیشانی گھسنا	ورغلانا	:	بہکانا، بھڑکانا
خفت	:	ہلکا پن، شرمندگی	خجالت	:	شرمندگی

17.9 معاون کتب

1۔ امجد حیدر آبادی ۔ رباعیاتِ امجد

2۔ امجد حیدر آبادی ۔ جمالِ امجد

3۔ صاحب حیدر آبادی۔ جنوبی ہند میں اُردو رباعی

4۔ محمد جمال شریف ۔ حیاتِ امجد

اکائی 18 علمِ بلاغت

18.1 اغراض ومقاصد

18.2 تمہید

18.3 علمِ بلاغت کی تعریف وافادیت

18.4 علومِ بلاغت

18.5 علمِ بیان

18.6 علمِ بدیع

18.7 صنائع معنوی

18.8 خلاصہ

18.9 نمونہ امتحانی سوالات

18.10 فرہنگ

18.11 معاون کتب

18.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ علم بلاغت کی تعریف وافادیت پر اظہار خیال کر سکیں۔

☆ علم بلاغت سے متعلق مختلف علوم بیان کر سکیں۔

☆ علم بیان کی قسمیں تشبیہ اور استعارہ پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ علم بدیع کے چند اہم صنعتوں کے بارے میں وضاحت کر سکیں۔

18.2 تمہید

انسان کو جو وصف دیگر جانداروں سے ممتاز کرتا ہے وہ اس کی قوت کلام ہے۔یعنی اور جاندار بات نہیں کر سکتے جب کہ انسان بات کر سکتا ہے۔اسی لیے اسے حیوان ناطق یعنی بولنے والا حیوان بھی کہا جاتا ہے۔ ہر انسان میں قوت کلام یا بات کرنے کی صلاحیت ایک جیسی نہیں ہوتی۔بعض لوگ بات کرتے ہیں تو سننے میں بھلا لگتا ہے۔اگر ہم غور کریں کہ ایسے لوگوں کی باتیں ہمیں کیوں اچھی لگتی ہیں؟ تو پتہ چلے گا کہ ان کی گفتگو عام لوگوں کی طرح سیدھی سادی نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنی گفتگو کو محاورے،ضرب الامثال اور اسی طرح کے بعض دیگر عناصر کے ذریعہ دلچسپ اور پر اثر بناتے ہیں۔ادب میں خیالات کے اظہار کے لیے کئی طرح

کی نزاکتوں اور فنی باریکیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ان نزاکتوں اور باریکیوں کا مطالعہ ہمارے لیے ضروری ہے کیوں کہ ان کے استعمال سے ہم بھی اپنی تحریر اور تقریر میں زور اور قوت پیدا کر سکتے ہیں۔ ان ادبی وسائل کا مطالعہ جن کے ذریعہ کلام میں حسن پیدا ہوتا ہے علم بلاغت کہلاتا ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم علم بلاغت اور اس کے ضروری اجزا کا مطالعہ کریں گے۔

18.3 علم بلاغت کی تعریف وافادیت

بلاغت کسی علم کا نام نہیں ہے، بلکہ بلاغت ایک تصور ہے۔ بلاغت کلام کی اس کیفیت کو کہا جا سکتا ہے جو زبان کو حسن اور خوبی کے ساتھ استعمال کرنے سے ظہور میں آتی ہے۔

بلاغت اس صورت حال کو کہتے ہیں جب کلام میں الفاظ معمولی زبان کے مقابلے میں زیادہ زور اور خوبی کے حامل ہوں۔ شعر میں زبان کے استعمال کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ عام زبان سے زیادہ بلند ہوتی ہے۔

بلاغت کے لغوی معنی ''تیز زبانی'' کے ہیں، اس کے مجازی معنی ہیں'' کلام کو دوسروں تک پہنچانے میں مرتبۂ کمال کو پہنچنا''۔

شاعر اپنی تخلیقی قوت سے لفظوں میں زور اور نئی توانائی بھر دیتا ہے۔ اس طرح کہ وہ عام سطح سے بلند ہوتے ہیں اور ایک واضح معیاری صورت اختیار کر لیتے ہیں یہی مرتبۂ کمال ہے۔

بلاغت کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ کلام سے کچھ مراد لینا اور اس میں مرتبۂ کمال کو پہنچنا، لیکن بلیغ کلام کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اظہار مطلب کے لیے کم سے کم الفاظ استعمال کیے جائیں۔

بلاغت کی صورت حال شعر میں الفاظ کے مناسب ترین استعمال سے ہی پیدا ہوتی ہے اور اس کا تعلق بلند جذبات اور عمیق افکار یا جذبات کے خلوص سے نہیں ہے۔ اسی طرح، زبان ومحاورہ کی صحت کا تعلق بلاغت سے نہیں بلکہ فصاحت سے ہے۔

بلاغت کی تعریف یہ کی گئی ہے اس میں حسب موقع کلام ہو۔ کچھ لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ فصاحت کلام اسے کہتے ہیں جس میں بہت سادگی ہو اور اشعار بہت آسان ہوں اور بلاغت وہ ہے جس میں بہت مشکل کلام پیش کیا جائے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بلکہ فصاحت میں بلاغت بھی ہوتی ہے اور اسی طرح بلیغ کلام بھی فصیح ہوتا ہے۔

خود جانچنے کے سوال

۱۔ علمِ بلاغت کسے کہتے ہیں؟

18.4 علومِ بلاغت

بلاغت کی کیفیت کلام میں کس طرح پیدا کی جائے، اس سوال کا جواب حاصل کرنے میں بعض علوم کارآمد ہیں۔ ان علوم کو عام طور پر علوم بلاغت کہا جاتا ہے۔ ان میں (۱) علم بیان (۲) علم بدیع (۳) علم عروض (۴) علم قافیہ

علمِ بیان میں ان طریقوں اور امکانات کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن کے ذریعہ ایک ہی معنی کو کئی طرح سے ادا کر سکتے ہیں۔

علمِ بدیع میں الفاظ کے معنوی اور صوری حسن اور ان کے طریقہ استعمال کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن کے ذریعہ کلام کی معنوی یا ظاہری خوب صورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ بدیع کے تحت کلام میں لائے گئے تمام خواص کو زبان میں ''صنائع اور بدائع'' کہتے ہیں۔

علمِ عروض ہمیں زبان کے آہنگ، شعر میں صوتی تنوع، پیچیدگی اور شعری آہنگ کے نئے امکانات اور موجود قوتوں کی توجیہہ اور تفصیل بیان کرنا سکھاتا ہے۔

علمِ قافیہ میں ان الفاظ کی آپس میں موسیقیاتی ہم آہنگی کا مطالعہ ہوتا ہے جو مصرعے کے آخر میں آتے ہیں اور تکرار صوت کے ذریعہ شعر میں حسن پیدا کرتے ہیں۔

بعض علما نے تاریخ گوئی، معما، توارد اور سرقہ کے تعین وغیرہ کو بھی علوم بلاغت میں شامل کیا ہے۔

خود جانچنے کے سوال

۲۔ علمِ بلاغت سے متعلق مختلف علوم کون کون سے ہیں؟

18.5 علمِ بیان

علمِ بیان کو ''علمِ ادب'' اور ''علمِ کتابت'' بھی کہتے ہیں۔ علمِ بیان وہ علم ہے جس کے تحت کسی معنی کو ادا کرنے کے لیے نت نئے انداز نکالے جائیں۔ علم بیان ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ کسی بات کو کس طرح مختلف طریقوں سے بیان کیا جائے کہ ایک معنی دوسرے سے زیادہ واضح اور دل کش ہوں۔

علمِ بیان، اظہار کے ان طریقوں کا مطالعہ کرتا ہے جن کے ذریعے کسی واقعہ، خیال یا کیفیت یا منظر کی صحیح تصویر کھنچ جائے اور سامع کا ذہن کہنے والے تک پہنچ جائے۔ گویا کسی بات یا خیال کو مختلف انداز سے اس طرح بیان کرنا جس سے اس کی ترسیل کا مقصد بھی پورا ہو جائے اور اس میں دلکشی، لطف و تاثیر کے علاوہ جدت اور ایجاز و اختصار بھی پیدا ہو۔ مثلاً میر انیسؔ کہتے ہیں:

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں　　اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

یہاں ایک پھول کے مضموں کو سو رنگ سے باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک ہی بات کو کئی طرح سے ادا کر سکتے ہیں جو کہ ایک کمال ہے۔

شاعری میں دریا کو کوزے میں بند کرنا ہوتا ہے۔ اس میں بالعموم کوئی بات براہِ راست نہیں بیان کی جاتی، اظہار کا بالواسطہ انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ کام علم بیان اور صنائع و بدائع کی مدد سے انجام دیا جاتا ہے۔

اوپر ہم نے علم بیان کی تعریف اور اس کے مقصد سے واقفیت حاصل کی۔ اب ہم علم بیان کی دو اہم قسموں تشبیہہ اور استعارے کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

خود جانچنے کے سوال

۳۔ علم بیان کی تعریف کیجیے؟

تشبیہ

تشبیہ کے لغوی معنی ہیں ''مشابہت دینا'' ایک چیز کو دوسری چیز سے مشابہت دی جاتی ہے۔ جب کوئی دو مختلف چیزوں کے درمیان مماثلت کے باعث ایک چیز کو دوسری چیز سے مشابہ قرار دیا جائے تو اسے تشبیہ کہتے ہیں۔ اس عمل کا مقصد شعر میں زور اور تاثیر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ جیسے:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

(میرؔ)

اس شعر میں لب کو گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ دونوں کی مشترکہ صفت نزاکت ہے۔ اس شعر میں لب اور گلاب میں نزاکت کے علاوہ دیگر اور خصوصیات بھی مشترک ہیں۔ مثلاً دونوں حسین و دل کش ہیں، دونوں مادی وجود رکھتے ہیں، دونوں تغیر پذیر ہیں، دونوں کھلتے ہیں یعنی تبسم کرتے ہیں، لیکن یہاں میرؔ نے صرف ظاہری وجہ بیان کی ہے۔

تشبیہ کے پانچ اجزا یا ارکان ہوتے ہیں:

۱۔ **مشبہ:** جس چیز کو تشبیہ دی جائے۔ اوپر کے شعر میں 'لب' مشبہ ہے۔

۲۔ **مشبہ بہ:** جس سے کسی چیز کو تشبیہ دی جائے۔ مذکورہ شعر میں گلاب کی پنکھڑی مشبہ بہ ہے۔

۳۔ **وجہ تشبیہ یا وجہ شبہ:** وہ صفات جس کی وجہ سے تشبیہ دی گئی۔ یہاں 'نزاکت' وجہ شبہ ہے۔

۴۔ **غرضِ تشبیہ:** جس غرض سے تشبیہ دی گئی۔ اس شعر میں غرضِ تشبیہ لب کی نزاکت کو ظاہر کرتا ہے۔

۵۔ **حروف تشبیہ:** وہ حروف جن کے ذریعے مشابہت دکھائی جاتی ہے۔ متذکرہ شعر میں 'سی' حروف تشبیہ ہے۔

خود جانچنے کے سوال

۴۔ تشبیہ کیوں دی جاتی ہے؟

استعارہ

استعارہ کے لغوی معنی ''مستعار لینا''، ''مانگنا''، ''ادھار لینا'' ہیں۔ علم بیان کی اصطلاح میں استعارے میں لفظ اپنے لغوی معنی کو ترک کر کے لسانی سیاق و سباق کے اعتبار سے نئے معنی مستعار لیتا یا یوں کہیے کہ انھیں آگے بڑھاتا ہے۔ استعارے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے طالب آملی نے صحیح کہا ہے کہ وہ شعر جس میں استعارہ نہ ہو، بے مزا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ استعارہ صرف ایک آرائشی امر نہیں، بلکہ شعر کا جوہر ہے۔

استعارے کی بنیاد تشبیہ پر ہوتی ہے۔ تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ میں مشابہت دکھائی جاتی ہے جب کہ استعارے میں مشابہت کی بنا پر مشبہ کو مشبہ بہ ٹھہراتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ زید شیر کی طرح بہادر ہے تو تشبیہ ہوگی لیکن بہادری وصف کی بنا پر شیر آیا کہہ کر زید آیا مراد لی جائے تو استعارہ ہوگا۔

جب کوئی لفظ اپنے حقیقی معنی کی بجائے مجازی معنی میں استعمال کیا جائے تو استعارہ کہلاتا ہے۔ استعارے کے لیے یہ شرط لازمی ہے کہ کلام میں ایسے اشارے ہوں جو قاری کے ذہن کو مجازی معنی کی طرف لے جائیں مثلاً میرؔ اپنے ایک مشہور شعر میں کہتے ہیں:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اِس کارگہِ شیشہ گری کا

بظاہر تو شعر کے یہ معنی نکلتے ہیں کہ چوں کہ جس طرح شیشہ گر کی دوکان میں بہت احتیاط سے چلنا چاہیے کیوں کہ نہ معلوم زرا سی بے احتیاطی سے کتنے شیشے چکنا چور ہو جائیں، اس لیے سانس لینے میں بھی بہت چوکنا رہنا چاہیے۔ مگر دراصل کارگہ شیشہ گری استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے اور سانس آہستہ لینا، سے مراد محتاط رہنا، ہوشیار رہنا اور بات کا خیال رکھنا ہو تو شعر کا مفہوم صرف لفظی نہیں ہوگا۔ یہاں منطق سے نہیں شاعرانہ منطق سے، صداقت سے نہیں شاعرانہ صداقت سے اور عقل سے نہیں دل کی آنکھ سے کام لیا گیا ہے۔

استعارہ کے ارکان چار ہیں:

۱۔ مستعار منہ: تشبیہ میں جسے مشبہ بہ کہا جاتا ہے، استعارہ میں اسے مستعار منہ کہتے ہیں۔ یعنی جس کو مثال کے لیے استعمال کیا جائے۔

۲۔ مستعار لہ: تشبیہ میں جسے مشبہ کہا جاتا ہے یعنی جس کو مثال دینا ہے، استعارہ میں اسے مستعار لہ، کہتے ہیں۔ تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ مل کر ''طرفین تشبیہ'' کہلاتے ہیں تو یہاں مستعار منہ اور استعار لہ مل کر ''طرفین استعارہ'' کہلاتے ہیں۔

۳۔ مستعار: وہ لفظ جس کے معنی مشبہ بہ میں واقع ہوئے ہیں۔

۴۔ وجہ جامع: وجہ شبہ کو استعارہ میں وجہ جامع کہا جاتا ہے۔ مثلاً یہ مصرع دیکھیے:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

اس میں استعارہ کے چاروں ارکان موجود ہیں:

انیسؔ کے اس مصرعے میں

مستعار منہ : شیر
مستعار لہ : حضرت عباسؓ (جن کا ذکر مخفی ہے)
مستعار : بہادری
وجہ جامع : حضرت عباسؓ کی بہادری کا اظہار

خود جانچنے کے سوال

۵۔ استعارہ کسے کہتے ہیں؟

تشبیہ اور استعارہ کا فرق

تشبیہ اور استعارہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں مشبہ کو مشبہ بہ کے مانند قرار دیا جاتا ہے۔ جب کہ استعارہ میں مشبہ کو بعینہٖ مشبہ بہ قرار دیا جاتا ہے۔ مثلاً خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر کوئی یہ کہے کہ میں نے پھول جیسی لڑکی دیکھی تو ظاہر ہے یہ تشبیہ ہوگی اگر یوں کہے کہ میں نے پھول دیکھا تو اسے استعارہ کہیں گے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تشبیہ میں معنی کی وضاحت اور شدت کے اظہار کے لیے غلو اور مبالغہ کے ساتھ ایک چیز کو دوسری قرار دینے (یعنی مشبہ کو مشبہ بہ قرار دینے) کو استعارہ کہتے ہیں۔

تشبیہ اور استعارہ کلام کا جوہر ہیں۔ یہ محض ظاہری خوب صورتی بڑھانے کا کام نہیں کرتے، بلکہ شعر کا عمل ہی ان کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔

خود جانچنے کے سوال

۶۔ تشبیہ اور استعارہ میں کیا فرق ہے؟

18.6 علمِ بدیع

علم بدیع، بلاغت کا ایک خاص شعبہ ہے۔ اس کو ''علم معنی'' بھی کہتے ہیں۔ اس شعبے میں شعر میں استعمال ہونے والی صنعتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

شاعری میں صنعتوں کی بڑی اہمیت ہے۔ صنائع کے استعمال سے کلام میں کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعہ شعر کے تاثر میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایمائیت کا خاص وصف پیدا ہوتا ہے اور ان سے شعر میں جہاں معنوی دلکشی پیدا ہوتی ہے وہیں اس کی نغمگی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

صنائع کی دو قسمیں کی جاتی ہیں (۱) صنائع لفظی (۲) صنائع معنوی۔

صنائع لفظی

صنائع لفظی سے مراد وہ خوبیاں ہیں جو لفظوں کو خاص رعایتوں اور ہنرمندی کے ساتھ برتنے سے وجود میں آتی ہیں۔

صنائع معنوی

صنائع معنوی کا تعلق معنوی خوبیوں سے ہوتا ہے۔ صنائع معنوی سے کلام کے معنوی محاسن واضح ہوتے ہیں۔

خود جانچنے کے سوال

۷۔ علم بدیع کسے کہتے ہیں؟

۸۔ علم بدیع کی کتنی قسمیں ہیں؟

18.7 صنائع معنوی

ذیل میں چند اہم صنائع معنوی کی وضاحت کی جائے گی۔

ایہام یا توریہ

ایہام کے لغوی معنی ''وہم میں ڈالنا'' اور توریہ کے معنی ''چھپانا'' کے ہیں۔شعر میں کوئی ایسا لفظ لایا جائے جس سے سامع یا قاری تھوڑی دیر کے لیے وہم میں پڑ جائے کہ اس کے صحیح معنی کیا ہیں۔ایسے لفظ کے عموماً دو معنی ہوتے ہیں۔اصطلاحاً ایہام سے مراد ایسے الفاظ کا استعمال ہے جن کے ایک قریبی معنی بھی ہوں اور دوسرا دور کا مفہوم بھی ہو۔قریبی معنی وہ ہے جس کی طرف قاری یا سامع کا ذہن فوری منتقل ہو لیکن شاعر کی مراد اس قریبی معنی سے نہ ہو اور معنیٔ بعید وہ ہے جو غور کرنے پر کھلے، شاعر کا مقصود اسی معنی سے ہو:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا　　(مومنؔ)

مومنؔ کے اس شعر میں کلیدی لفظ ''گویا'' ہے جس پر ایہام کی بنیاد ہے۔اس لفظ کے معنیِ قریب ہے ''جیسا''۔جب کہ معنیِ بعید ہے ''بولتا ہوا''، متکلم کے معنی میں۔اس شعر میں شاعر کا حقیقی مقصد معنیِ بعید سے ہے۔اس طرح ایہام کی صنعت پیدا کی گئی ہے۔

خود جانچنے کے سوال

۹۔　ایہام سے کیا مراد ہے؟

تجاہلِ عارفانہ

اس کے لغوی معنی ''جان بوجھ کر انجان بننے'' کے ہیں۔اصطلاحاً کسی بات یا چیز کو جانتے ہوئے بھی بے خبری یا لاعلمی کا اظہار کرنا تجاہل عارفانہ کہلاتا ہے۔اس کا مقصد کسی کی تعریف میں مبالغہ کرنا ہے:

مثال۱۔

پوچھتے ہیں وہ کہ 'غالبؔ کون ہے؟'　　کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟　　(غالبؔ)

یہاں غالبؔ نے اپنی تعریف میں مبالغہ کیا ہے۔

مثال۲۔

صنم کہتے ہیں تیرے بھی کمر ہے　　کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے　　(جرأتؔ)

یہاں تجاہل سے کمر کے باریک ہونے میں مبالغہ ہے۔

مثال۳۔

تارے آنکھیں جھپک رہے تھے　　تھا بام پہ کون جلوہ گر رات　　(مومنؔ)

یہاں مومنؔ نے اپنے محبوب کی تعریف میں مبالغہ کیا ہے۔

خود جانچنے کے سوال

۱۰۔ صنعت تجاہل عارفانہ والا کوئی ایک شعر بتایئے؟

تضاد

شعر میں ایسے الفاظ کا استعمال کیا جائے جن میں معنی کے اعتبار سے تضاد پایا جائے یعنی جو معنی میں ایک دوسرے کی ضد ہوں جیسے دن اور رات، مرنا اور جینا، عرش اور فرش، اچھا اور برا وغیرہ۔ اس صنعت کو 'صنعت طباق' کا نام بھی دیا گیا ہے۔ یہ تضاد اسم، فعل، حرف اور دوسرے اجزائے کلام کے مابین بھی ہوسکتا ہے جیسے خواب اور بیداری، فرشتہ اور شیطان، صبح اور شام وغیرہ:

مثال ۱۔

ترے کُوچے اس بہانے ہمیں دن کو رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اُس سے بات کرنا

مصحفی کے اس شعر میں دن اور رات دو متضاد لفظ ہیں۔

مثال ۲۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا! نہ ہو مرنا' تو جینے کا مزا کیا؟ (غالبؔ)

غالبؔ کے اس شعر میں مرنا اور جینا دو متضاد لفظ ہیں۔

مثال ۳۔

درد' منت کشِ دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا' برا نہ ہوا (غالبؔ)

غالبؔ کے اس شعر میں اچھا اور برا دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں بلکہ درد اور دوا میں تضاد کی رعایت پائی جاتی ہے۔

خود جانچنے کے سوال

۱۱۔ صنعت تضاد میں کیسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں؟

حسنِ تعلیل

تعلیل کے معنی ہیں ''وجہ متعین کرنا'' یا ''وجہ بیان کرنا''۔ اگر کسی شئے یا امر کے لیے کوئی ایسی وجہ بیان کی جائے جو چاہے حقیقت میں اس کا اصل سبب نہ ہو مگر اس میں کوئی شاعرانہ جدت و نزاکت ہو اور بات واقعہ اور فطرت سے مناسبت بھی رکھتی ہو تو اسے حسنِ تعلیل کہتے ہیں:

بلند سبزۂ ساحل چڑھا ہوا دریا پئے زیارت مولا بڑھا ہوا دریا

دریا کی طغیانی کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ وہ امام حسینؓ کی زیارت کے لیے بڑھا آتا تھا۔

پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی (انیسؔ)

دریا کی موجیں ساحل سے ٹکراتی رہتی ہیں اور یہ ایک فطری عمل ہے اس کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت حسینؓ کی سپاہ تین دن سے پیاسی تھی اور اسی غم میں موجیں سر پٹکتی تھیں۔

شاعر کے اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت امام حسینؓ اور ان کے ساتھی تشنہ لب تھے لیکن اس کی اصل علت یہ ہے کہ ہوا کے جھونکوں سے موجیں اٹھتی تھیں اور ساحل فرات سے ٹکراتی تھیں۔

خود جانچنے کے سوال

۱۲۔ تعلیل کے معنی بیان کیجیے؟

تلمیح

تلمیح سے مراد شعر یا کلام میں کسی اہم یا مشہور قصہ، واقعہ، کردار، مسئلہ، مثل، قول، اصطلاح نجوم، شخصیت یا کسی مذہبی روایت کی طرف اشارہ کیا جائے۔ تلمیح کے استعمال سے ایک یا چند الفاظ کے ذریعے وہ سارا قصہ یا واقعہ سامنے آجاتا ہے جس کی طرف شاعر اشارہ کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح تلمیح شعر میں کفایتِ لفظی اور ایمائیت پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے:

مثال ۱۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی　　(اقبالؔ)

اس شعر میں حضرت ابراہیمؑ اور آتشِ نمرود کے مشہور واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

مثال ۲۔

کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ　　صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا　　(غالبؔ)

مذکورہ شعر میں شیریں اور فرہاد کے مشہور قصے کی طرف اشارہ ہے۔

خود جانچنے کے سوال

۱۳۔ تلمیح کی تعریف کیجیے؟

لف ونشر

لف کے لغوی معنی ہیں ''لپیٹنا'' اور نشر کے معنی ''کھولنے'' یا ''پھیلانے'' کے ہیں۔ چوں کہ اس صنعت میں پہلے چند چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے پھر ان چیزوں کے مناسبات کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کا نام لف ونشر ہے جیسے:

مثال ۱۔

تیرے رخسار وقد وچشم کے ہیں عاشق زار　　گل جدا سرو جدا نرگس بیمار جدا

اس شعر کے پہلے مصرعے میں تین چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ رخسار، قد اور چشم۔ اب ان تینوں کی مناسبات سے گل، سرو اور نرگس

آئے ہیں یعنی رخسار کی مناسبت سے گل، قد کی مناسبت سے سرو اور چشم کی مناسبت نرگس کا استعمال ہوا ہے۔ یہاں پہلے مصرعے کے بیانات اور دوسرے مصرعے کی مناسبات میں ترتیب پائی جاتی ہے۔

مثال۲۔

رخ و جبیں و مژہ نیز و چشم و ابرو کو　　سنان و بدر و مہ و نرگس و ہلال لکھا　　(نظیر)

اس شعر میں رخ کی مناسبت سے بدر، جبیں کی مناسبت سے مہ، مژہ کی مناسبت سے سنان، چشم کی مناسبت سے نرگس اور ابرو کی مناسبت سے ہلال لیکن یہ مناسبتیں بلاترتیب آئی ہیں۔

مثال۳۔

چھپتی تھیں بھاگی جاتی تھیں گرتے تھے خاک پر
قبضوں سے تیغیں جسم سے روحیں تنوں سے سر
(انیس)

چھپتی تھیں کی مناسبت قبضوں سے تیغوں کے چھپنے کو ہے۔ یعنی جب تیغ جسم میں داخل ہو جائے اور قبضہ تک دھنس جائے تو گویا وہ قبضے سے چھپ جاتی ہے۔ ایک اور مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تیغ ٹوٹ گئی اور قبضہ سے علاحدہ ہو کر دور جا گری گویا روپوش ہوگئی۔ اسی طرح بھاگی جاتی تھیں کی مناسبت جسم سے روح کے نکلنے کو ہے۔ خاک پر گرنے کو سروں کے کٹ کر زمین پر گرنے سے مناسبت ہے۔

خود جانچنے کے سوال

۱۴۔ لف ونشر کے معنی بتایئے؟

مبالغہ

مبالغہ کے لغوی معنٰی ''کسی بات کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرنا''، ''حد سے زیادہ تعریف یا برائی کرنا'' ہیں۔ کسی بات، شخص یا چیز کی تعریف یا مذمت کو شدت سے اور بڑھا چڑھا کر پیش کرنا کہ سامع کو یہ گمان ہو کہ اس وصف یا ذم کا کوئی اور مرتبہ باقی نہیں رہا مبالغہ ہے۔ جیسے

مثال۱۔

گرگ نے دورِ عدل میں اُس کے　　سیکھ لی راہ و رسم چوپانی　　(مومن)

گرگ (بھیڑیے) کا چوپانی (گلہ بانی) کے طور طریق سیکھنا مبالغہ ہے۔ چوپانی سے مراد جانوروں کے گلے کو چرانا اور اس کی رکھوالی کرنا ہے۔ بھیڑیا جو جانوروں پر حملہ کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ اس کا جانوروں کی حفاظت کرنا محال ہے اس لیے یہ مبالغہ ہے۔

مثال۲۔

چمکے جو تیغ قہر کسی روز جنگ میں　　ٹھہرے نہ سایہ خوف کے مارے بدن کے پاس　　(اسیر)

تیغ قہر کے چمکنے پر خوف کے مارے سایہ کا بدن کے پاس نہ ٹھہرنا مبالغہ ہے۔

خود جانچنے کے سوال

۱۵۔ مبالغے کے لفظی معنی کیا ہیں؟

مراعات النظیر

مراعات کے معنی ہیں رعایت، مناسبت، لحاظ اور نظیر سے مراد ہے مانند، مثال اور نمونہ۔ اسے تناسب، توفیق، ایتلاف اور تلفیق بھی کہا جاتا ہے۔ ضلع جگت بھی اسی قبیل سے متعلق ہے۔ مراعات النظیر سے مراد یہ ہے کہ شعر میں ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو آپس میں کوئی مناسبت رکھتے ہوں مگر یہ نسبت تضاد و تقابل کی نہ ہو جیسے دریا کے ذکر کے ساتھ ناخدا، کشتی، بھنور، طوفان، لنگر، حباب، کنارہ، بجرہ وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کرنا یا چمن کے ساتھ باغبان، گل، صیاد، بلبل وغیرہ کا ذکر کرنا۔

مثال ا۔

رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے　　　　نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں　　(غالبؔ)

یہاں رخش (گھوڑا) کی مناسبت سے باگ، رکاب وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

مثال ۲۔

خط بڑھا کاکل بڑھی زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے　　　　حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے　　(ذوقؔ)

خط، کاکل، زلف اور گیسو یہ سب ایک ہی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

خود جانچنے کے سوال

۱۶۔ مراعات کے معنی بتایئے؟

۱۷۔ نظیر سے کیا مراد ہے؟

18.8 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے علم بلاغت کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس سلسلے میں علم بلاغت کی تعریف وافادیت پر روشنی ڈالی گئی پھر اس سے متعلق مختلف علوم کی وضاحت کی گئی۔ علم بیان کی تعریف کی گئی اور اس کی دو قسموں تشبیہ اور استعارے پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی۔ اس کے بعد علم بدیع کی تعریف اور اس کی اقسام کی وضاحت کی گئی۔ پھر علم بدیع کی ایک شاخ صنائع معنوی کے چند معروف واہم صنعتوں جیسے ایہام، تجاہل عارفانہ، تضاد، حسن تعلیل، تلمیح، لف ونشر، مبالغہ اور مراعات النظیر کا مطالعہ کیا گیا اور مثالوں سے ان صنائع کی وضاحت کی گئی۔ طلبہ کی سہولت کے لیے فرہنگ بھی دی گئی ہے اور امتحانی سوالات کا نمونہ بھی پیش کیا گیا۔ آخر میں مزید مطالعے کے لیے اس موضوع سے متعلق چند اہم کتابوں کی نشان دہی بھی کی گئی۔

18.9 نمونہ برائے امتحانی سوالات

ذیل کے سوالات کے جوابات پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے۔

۱۔ استعارہ کسے کہتے ہیں۔مثالوں سے واضح کیجیے؟

۲۔ تشبیہ اور استعارے میں کیا فرق ہے؟

۳۔ ایہام اور حسن تعلیل کی تعریف کیجیے اور ہر ایک کی مثالیں دیجیے۔

ذیل کے سوالات کے جوابات تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

۱۔ علم بلاغت پر نوٹ لکھیے۔

۲۔ تشبیہ کی تعریف کیجیے اور ارکان تشبیہ کو مثالوں سے واضح کیجیے۔

۳۔ صنائع معنوی سے کیا مراد ہے؟ کوئی دو معنوی صنعتوں کی تشریح کیجیے۔

18.10 فرہنگ

ظہور : نمود۔نمائش

بلیغ : فاضل۔حسبِ موقع گفتگو کرنے والا

افکار : فکر کی جمع

کارآمد : فائدہ مند۔مفید مطلب

عروض : وہ علم جس سے نظم کے قواعد معلوم ہوتے ہیں

امکانات : امکان کی جمع۔طاقت۔مقدور۔اختیار

تکرار : دہرانا۔بار بار کہنا

نت نئے : تازہ بتازہ

تاثیر : اثر۔خاصیت

ایجاز واختصار: مختصر کرنا

تبسم : مسکراہٹ

منطق : گفتگو۔خوش کلامی۔فصاحت

رن : جنگل۔بیابان

وضع : ایجاد کرنا

مرہونِ منت: احسان مند۔شکر گزار

مقصود : ارادہ کیا گیا۔مراد۔غرض

مجازی : غیر حقیقی۔فرضی۔نقلی

عمیق : گہرا

فصیح : خوش بیان۔شیریں کلام

صوری : ظاہری

خواص : خاص کی جمع۔خاصیتیں

آہنگ : نغمہ

تعین : مقرر کرنا۔معین کرنا

ترسیل : بھیجنا۔روانہ کرنا

جدت : نیاپن۔تازگی۔نیا ہونا

مشابہ : مانند۔مثل۔نظیر۔ہم شکل

متذکرہ : ذکر کیا گیا۔مذکورہ

صداقت : سچائی۔خلوص۔تصدیق

زائیدہ : پیدا کیا ہوا

معرض : ظاہر ہونے کی جگہ

محاسن : خوبیاں۔اچھائیاں

قرینہ : قیاس۔۔انداز۔مناسبت

خفی	:	پوشیدہ۔چھپاہوا	متضاد	:	برعکس۔خلاف۔الٹا
نشاطِ کار	:	کام کرنے کی امنگ۔کارگذاری کا شوق	منت کش	:	احسان مند۔احسان اٹھانے والا
تیغ	:	تلوار۔شمشیر	روپوش	:	چھپاہوا۔پوشیدہ
مذمت	:	برائی۔ہجو	بجرہ	:	ایک قسم کی گول اور خوب صورت کشتی
باگ	:	لگام			

رکاب : وہ آہنی حلقہ جو گھوڑے کے زین میں دونوں طرف لٹکتا رہتا ہے اور سوار اس پر پاؤں رکھ کر گھوڑے پر چڑھتا ہے۔

18.11 معاون کتب

۱۔ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی درس بلاغت

۲۔ پروفیسر وہاب اشرفی تفہیم البلاغت

۳۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی اردو شاعری میں صنائع و بدائع

ر